اختر بلوچ

کرانچی والا 2

اختر بلوچ

کراچی والا

(حصہ دوم)

کتاب کا نام: کرانچی والا (حصہ دوم)

مصنف کا نام: اختر بلوچ

پہلی اشاعت: مئی 2019

تعداد: 500

زیر اہتمام: علم وادب پبلشر اینڈ بک سیلر

علم وادب پبلشر اینڈ بک سیلر

دکان نمبر 311، تھرڈ فلور، بک مال، اردو بازار، کراچی

رابطہ نمبر 0335-2620640 / 0331-2952483

www.facebook.com/ilmoadabpublisher

ilmoadabpublisher@gmail.com

انتساب

پاکستان کی تین نسلوں کے صحافتی استاد،

حقوقِ انسانی کی بحالی

اور

انسان دوستی کے علم بردار

جناب حسین نقی

اور

معروف ماہرِ تعلیم، فلسفی اور بلوچوں کی

قبائلی روایتوں کے امین

پروفیسر مٹھا خان مری

کے نامِ نامی

جن کی تربیت اور رہنمائی سے آج بھی استفادہ کرتا ہوں

ترتیب

❊

عوامی مورخ

اختر بلوچ کا شمار سیاست اور تاریخ کے نمایاں طالب علموں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر لکھنے میں خاصی تاخیر کی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے تاریخ کو صحیح معنوں میں عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میری اختر بلوچ سے شناسائی بیس برسوں سے زائد کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ میر پور خاص کے روشن خیال نوجوانوں کے حلقے میں ایک فعال کردار ادا کر رہے تھے۔ اس حلقے کے روح رواں مرحوم رفیق احمد نقش تھے۔ میر پور خاص کے ان نوجوانوں کا اکھ گاہے گاہے مجھے بھی تاریخ اور سیاست پر گفتگو کے لیے مدعو کرتا تھا۔ نوجوانوں کی اس تنظیم کی ایک خاص بات جو مجھے بہت پسند تھی وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے پروگرام کا آغاز ہمیشہ مقررہ وقت پر کرتے تھے۔

ایک بار مجھے میر پور خاص پریس کلب کی جانب سے لیکچر کے لیے دعوت دی گئی جس کا وقت پانچ بجے شام طے کیا گیا تھا۔ میں مقررہ وقت پر پریس کلب پہنچ گیا۔ سامعین کی ایک بڑی تعداد پریس کلب میں موجود تھی پانچ بج چکے تھے لیکن پروگرام شروع نہیں ہوا۔ مجھے یہ بات ناگوار محسوس ہوئی۔ میں نے ایک نوجوان سے پوچھا کہ اختر بلوچ کہاں ہیں؟ لڑکے کے جاتے ہی اختر بلوچ آگئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے انھوں نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ایک مصیبت ہوگئی ہے باہر متحدہ قومی موومنٹ کے عہدے داران اور کارکنان کی ایک بڑی تعداد ان کے نمائندے شاہد اقبال سمیت موجود ہیں جو بغیر دعوت کے پروگرام میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اب آپ بتایئے کیا کریں؟ میں نے کہا آنے دو کوئی حرج نہیں ہے۔ خیر لیکچر ختم ہوگیا ہم جب ہال سے باہر نکلے تو متحدہ کے کارکنوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا میری کتابوں پر دستخط بھی کروائے۔ اس موقع پر انھوں نے مجھے بتایا کہ قائد تحریک کی جانب سے خصوصی ہدایت جاری کی گئی ہے کہ کارکن میری کتاب ضرور پڑھیں اور میرے لیکچرز بھی اٹینڈ کیا کریں۔ یہ سن کر میں نے ہنستے ہوئے اختر بلوچ سے پوچھا کہ میرے لکھنے میں کوئی کمی بیشی ہوگئی ہے یا ان میں عقل آگئی ہے۔

بعدازاں اختر بلوچ حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد اس زمانے کے شاید رواج کے مطابق وہ بھی نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں نامعلوم ہو گئے۔ پھر وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصے قبل اختر بلوچ کی تحریریں ڈان کی ویب سائٹ پر شائع ہونا شروع ہوئیں۔ ان تحریروں کا عنوان کراچی والا تھا۔ ان تحریروں کا پہلا مجموعہ 2016 میں شائع ہوا۔ اس کی دوسری اشاعت 2018 میں ہوئی۔ اس سلسلے کی یہ دوسری کتاب میرے زیرِ نظر ہے، جس میں کچھ ایسے انکشافات کیے گئے ہیں جو اس سے قبل اس طرح ضبطِ تحریر میں نہیں لائے گئے۔ بلکہ حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ جس کی ایک مثال قراردادِ لاہور کی منظوری کی تاریخ میں ردوبدل ہے۔ یہ سب کیوں ہوا؟ بائیس مارچ کو پیش کی گئی قرارداد چوبیس مارچ 1940 کو منظور ہوئی تھی۔ آخر وہ کیا اسباب تھے جن کی بنیاد پر چوبیس مارچ کو 23 مارچ کیا گیا؟ اختر بلوچ اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ان کے مطابق پاکستان میں آئین سازی کا عمل 1956 میں مکمل ہوا، وزیرِ اعظم چوہدری محمد علی نے گورنر جنرل سے آئین کی باقاعدہ منظوری کے لیے تاریخ مانگی، گورنر جنرل نے 23 مارچ کا دن چنا، 1940 سے لے کر 1947 تک اور آزادی کے بعد بھی 23 یا 24 مارچ کا دن سرکاری طور پر منایا نہیں جاتا تھا اور نہ ہی تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں تعطیل ہوا کرتی تھی۔''

''گورنر جنرل کی جانب سے 23 مارچ کا دن اتفاقاً چنا گیا، پھر اس تجویز کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ اجلاس میں 23 مارچ کو یومِ جمہوریہ یا ری پبلک ڈے کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا، مگر کابینہ کے اُس اجلاس میں قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان کا ذکر تک نہ تھا۔''

1956 کے بعد 1957 اور 1958 میں بھی 23 مارچ یومِ جمہوریہ کے طور پر منایا گیا۔ جب اکتوبر 1958 کے مارشل لا کے بعد آئندہ برس کا 23 مارچ کا دن نزدیک آنے لگا، تو کابینہ نے فیصلہ کیا کہ اس دن کو یومِ جمہوریہ کے بجائے یومِ پاکستان کے طور پر منایا جائے گا۔ یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد 1956 کا آئین منسوخ ہو چکا تھا اور نئے آئین کے مسودے پر کام جاری تھا۔

ان دنوں 14 اگست یومِ پاکستان کے طور پر منایا جاتا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ 23 مارچ کو یومِ پاکستان اور 14 اگست کو یومِ آزادی کے عنوان سے موسوم کیا جائے، گو چند سال کے بعد مارشل لا اٹھا لیا گیا۔ 1962 اور بعدازاں 1973 کے آئینِ پاکستان کے تحت بھی پاکستان جمہوریہ رہا، مگر 23 مارچ کا دن یومِ جمہوریہ کے بجائے یومِ پاکستان کے طور پر منایا جاتا رہا۔

اسی طرح معروف کمیونسٹ رہنما مرحوم جام ساقی کا گرفتاری سے بچنے کے لیے مولوی کا بھیس بدلنا اور اس روپ کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے انھیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ احمد سلیم او نزہت

عباسی اپنی کتاب ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی'' میں مزید لکھتے ہیں کہ، روپوشی کے اس طویل دور میں جام ساقی نے داڑھی بڑھالی تھی اور تبلیغی جماعت والوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کرلیا تھا۔ اگرچہ انھیں 1978 سے پہلے گرفتار نہ کیا جاسکا لیکن کئی مرتبہ ان کے کمیونسٹ دل اور انسان دوستی کے جذبات انھیں گرفتاری کی طرف لے گئے تھے۔ اس عرصے میں راقم الحروف سے بھی ایک دوبار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اسی حلیے میں تھے لیکن انھوں نے ٹوٹے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے، میں نے مسکرا کر کہا تھا:

کامریڈ! احتیاط کریں۔ تبلیغی جماعت والے ٹوٹے ہوئے چپل نہیں پہنتے۔

ہم نے خود جام ساقی کی زبانی ایسے کئی واقعات سنے جنھیں دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ کچھ یوں تھا کہ:

''ایک دفعہ بس میں، میں نذیر عباسی کے ساتھ جارہا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے کولہی (نچلی ذات کے ہندو) کو تکلیف کی حالت میں کھڑا دیکھا۔ میں کھڑا ہوگیا اور اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔ وہ میری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب ہم ٹنڈوالہیار پہنچے تو نذیر عباسی بولا کہ کامریڈ! آپ کسی دن مروائیں گے، کوئی بھی اصلی مولوی بوڑھے اور بیمار کولہی کو اپنی جگہ نہیں دیتا۔ اگر بس میں کوئی سی آئی ڈی کا آدمی ہوتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ آپ اصلی مولوی نہیں ہیں۔''

ایک روز کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ:

ایک بار جامع مسجد کے پاس سے گزر رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔ مولوی صاحب جنازہ پڑھادیں۔ انھیں جنازہ پڑھانا تو آتا نہیں تھا (اس واقعے کے بعد سیکھ لیا تھا) جام ساقی نے ان سے معذرت کی اور کہا وہ بہت جلدی میں ہیں۔ انھیں ایک ضروری کام کے لیے کہیں پہنچنا ہے، اس لیے جنازہ پڑھانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر جام چل پڑے تو پیچھے سے آواز آئی، یہ سالا کسی دعوت پر جارہا ہوگا۔ جام کو خوشی ہوئی کہ وہ پہچانے نہیں گئے اور یہ گالی مولوی کو پڑی ہے، انھیں نہیں۔

جناح صاحب کی جائے پیدائش کہاں ہے؟ کراچی کے وزیر مینشن یا ٹھٹھہ کے گاؤں جھرک میں، اس کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آرا ہیں لیکن اختر بلوچ نے اس معاملے پر بھی تحقیق کے بعد اپنے پڑھنے والوں کے سامنے تمام حقائق کھول کر رکھ دیے ہیں تاکہ وہ خود اس بات کا فیصلہ کریں کہ سچ کیا ہے۔ ابتدا میں اختر بلوچ نے اپنی تحریروں کا مرکز صرف کراچی کو بنایا لیکن وہ آہستہ آہستہ اپنا دائرہ سندھ کے دیگر شہروں تک بھی پھیلا رہے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ امید ہے کہ وہ اس سلسلے کو پاکستان کے دیگر صوبوں تک بھی پھیلائیں گے۔ اختر بلوچ کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تعصب سے

بالاتر ہو کر ایسے تمام لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں جنھوں نے سماج کی خدمت بغیر کسی مذہبی بھید بھاؤ کی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی شخصیات کے بارے میں لکھنے کا رجحان ذرا کم ہی ہے۔

بھگت کنور رام سندھ کی ایسی شخصیت تھی جو بغیر کسی مذہبی تفریق کے لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ اختر بلوچ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''بھگت کنور رام تقسیم سے قبل سندھ کی ایک ایسی ہستی تھے جنھوں نے سماج سیوا میں کوئی بھید بھاؤ نہ کیا اور نہ ہی ہندو مسلم کی تفریق رکھی۔ وہ ایک عظیم موسیقار اور گلوکار تھے، لوگ ان کا کلام سننے کے لیے جوق در جوق پہنچتے تھے اور ہزاروں روپے ان پر نچھاور کرتے تھے لیکن محفل کے اختتام کے بعد وہ یہ تمام رقم ہندو اور مسلمان ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ انھیں 1939 میں پیر آف بھر چونڈی کے پیروکاروں نے قتل کر دیا تھا۔ سینئر صحافی، ادیب، محقق اور دانش ور شیخ عزیز کے مطابق جس وقت قاتل انھیں قتل کرنے وہاں پہنچے تو ان کے کسی چاہنے والے نے سنتروں کا ایک ٹوکرہ انھیں تحفہ دیا تھا۔ انھوں نے خوش دلی سے قاتلوں کا استقبال کیا اور انھیں اپنے ہاتھوں سے سنترے چھیل کر کھانے کے لیے دیے۔''

اختر بلوچ کی نگارشات کا ایک پہلو تحقیقاتی صحافت ہے جو تاریخ کے چھپے ہوئے گوشوں اور کرداروں کو کھوج کر قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ پاکستان میں ایسا کام بہت محدود پیمانے پر ہو رہا ہے کیونکہ ہر شعبے میں معاشرہ بھیڑ چال کا شکار ہے۔ اختر بلوچ داد و تحسین کے حق دار ہیں کہ وہ اپنے قلم سے قارئین کو معلومات ہی نہیں فراہم کر رہے بلکہ اپنی تاریخ کے بارے میں آگاہی بھی دے رہے ہیں جو بلاشبہ لائق تحسین ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ اختر بلوچ نے روایتی تاریخ سے ہٹ کر عام اور نادار لوگوں کی گم شدہ تاریخ کو تحریر کیا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ کہ ان کی تحقیق کا مقصد سندھ کے چھوٹے شہروں اور قصبوں کے رہنے والے ان لوگوں کو بھی منظر عام پر لانا ہے جو بڑے شہروں کی چھاؤں میں کہیں گم ہو گئے تھے۔ پاکستان کی تاریخ کا المیہ یہ بھی ہے کہ اسے حکمران طبقوں کے مفادات کے تحت بار بار بدل کر مسخ کیا گیا۔

اختر بلوچ نے ایسے بہت سے مغالطوں اور مبالغوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اختر بلوچ کا تاریخ پر یہ کام اُن کی اپنی ذاتی دلچسپی اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک عوامی مورخ کی حیثیت میں ابھرے ہیں۔ پاکستان اور سندھ کی تاریخ میں ایسے لاتعداد موضوعات ہیں جن پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ اختر بلوچ ایک ایسی متبادل تاریخ لکھ کر عوام کے احساس اور تاریخی شعور میں اضافہ کریں گے۔

چہ دلاور است

ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہماری تحریروں کی زبان آسان ہو لیکن کیا کریں ہمیں اپنی اس تحریر کا عنوان فارسی میں تجویز کرنا پڑا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو ہم لکھ رہے ہیں اس کے لیے اس سے بہتر عنوان ہو نہیں سکتا۔ ''چہ دلاور است دُزدے کہ بہ کف چراغ دارد''۔ اس کے معنی آسان اردو میں یوں ہیں: ''کتنے دلیر ہیں وہ چور جو چوری کرتے ہوئے ہاتھوں میں چراغ رکھتے ہیں۔'' (چراغ کو آپ ٹارچ بھی کہہ سکتے ہیں۔) کچھ عرصے قبل کی بات ہے ہمارے ایک دوست نما اُستاد امجد قمر نے اسلام آباد سے فون کیا کہ ایک ٹی وی چینل کے ''نام ور ڈاکٹر دانش ور نما اینکر'' (یہ ڈاکٹر ایم بی بی ایس ہیں پی ایچ ڈی نہیں اور پی ٹی وی سمیت بے شمار نجی چینلوں پر اپنی دانش وری کا سکہ جما چکے ہیں، علاوہ ازیں اپنی سنسنی خیزی کے باعث عدالتِ عظمیٰ کو بھی بھگت چکے ہیں۔) نے ہمارے یہودی مسجد پر لکھے جانے والے بلاگ پر ایک پورا پروگرام کر ڈالا اور تمام کا تمام مواد ہمارے بلاگ کا تھا۔ حتیٰ کہ تصاویر بھی، لیکن کہیں بھی ہمارا حوالہ نہ تھا۔ امجد قمر نے پروگرام کا لنک بھی ہمیں بھیج دیا۔ میں نے اور میرے ڈان ڈاٹ کام کے ساتھی منظر الٰہی اور وقار نے وہ پروگرام دیکھا اور بہ قول شاعر ''ہم چپ رہے ہم ہنس دیے، منظور تھا پردہ تیرا''۔

تقریباً ایک ہفتے بعد ہمارے اسلام آباد کے ایک دوست سہیل انور نے فون پر ہمیں بتایا کہ مذکورہ ڈاکٹر دانش ور نے ہمارا ایک اور بلاگ ''قصہ فاطمہ جناح کی تدفین کا'' پر بھی پروگرام کر ڈالا ہے اور بالکل اُسی انداز سے۔ یعنی بغیر کسی حوالے کے۔ اُنھوں نے ہمیں لنک بھیجا۔ بات

بالکل دُرست تھی۔ اس سے قبل ہمارے ڈان ڈاٹ کام کے ساتھی مرحوم آزاد قلم دار کو ہم نے بتایا تھا کہ کراچی کے ایک مقامی اخبار نے بھی ہمارے بلاگ چھاپنا شروع کیے لیکن اُن کی اعلیٰ ظرفی یہ تھی کہ وہ نہ صرف ڈان ڈاٹ کام کا حوالہ دیتے تھے بلکہ ہمارا نام بھی چھاپتے تھے۔ کچھ دن بعد بلوچستان کے ایک دوست کا فون آیا اور انھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہم بلوچستان کے اخبارات میں کالم لکھتے ہیں۔ ہم نے اس بات سے انکار کیا تو انھوں نے اخبارات کی کاپیاں ہمیں بہ ذریعہ ڈاک ارسال کر دیں جن سے اُن کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ معاملہ صرف یہاں تک ہی محدود نہیں، کچھ عرصے قبل لاہور گئے تو معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک اُردو اخبار کے لیے بھی ہم کالم لکھتے ہیں۔ ہم معاملہ سمجھ گئے۔ ہم نے اُن سے دریافت کیا کہ کہیں ڈان ڈاٹ کام کا ذکر تھا؟ اُنھوں نے نفی میں سر ہلایا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر یہ سب لکھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے زورِ قلم سے آپ کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم بلاگ اُردو میں لکھتے ہیں جن کا انگریزی میں ترجمہ آدرش ایاز لغاری اور عارف انجم ڈان انگلش کے لیے کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ بعض سندھی رسائل میں ہمارے نام سے چھپتا ہے۔

ہمارے بلاگ کی مقبولیت کی وجہ کیا ہے؟ اِس بارے میں ہمارے صحافی دوست عزیز سنگور کا کہنا ہے کہ اِس کی وجہ ہماری تحریروں میں دیے جانے والے مستند تاریخی حوالے ہیں جو ان بلاگ کو ہمیشہ قابلِ توجہ بناتے ہیں۔ یہ تاریخ کے طالبِ علموں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ ہمارے ساتھی اختر سومرو سے جب اس ضمن میں بات ہوئی تو اُن کا کہنا تھا کہ ہم جس قسم کی معلومات اپنے بلاگ میں دیتے ہیں وہ صرف کتابی اور نقل در نقل نہیں ہوتی بلکہ اس میں تحقیق چھان بین کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ تاریخی معلومات کا تقابلی جائزہ بھی لیا جاتا ہے جس کا اب رواج نہیں رہا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ کسی مقام کے بارے میں لکھنے سے پہلے اُس کا دورہ کرنا اہم ہوتا ہے جو عموماً لوگ نہیں کرتے۔ جہاں تک ہمارے تاریخی حوالے دینے کا معاملہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اگر کسی دوست نے اس سلسلے میں راہ نمائی کی ہو تو اس کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ ہمارے دوست فوٹو جرنلسٹ اطہر بھائی نے ایک نجی محفل میں ہم سے کہا کہ بھائی کبھی ہم سے بھی پوچھ لیا کرو اور اگر پوچھ نہیں سکتے تو ساتھ ہی لے جایا کرو۔ اس بہانے ہمارا نام تو دے دو

گے۔ اِس بات پر محفل میں سبھی لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ حوالوں کا یہ طریقہ ہم نے ڈان ڈاٹ کام کے مرحوم ایڈیٹر مصدق سانول سے سیکھا تھا۔ ہم نے اُن کی اس بات کو گرہ سے باندھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ہمارے بلاگ نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے قارئین نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ معلومات کی تصحیح اور راہ نمائی بھی کرتے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آج ہم مکمل طور پر خود ستائشی پر اُترے ہوئے ہیں اور انجمنِ ستائشِ باہمی کے مرکزی صدر لگتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے ہم پان کھانے کے بہت شوقین ہیں گویا اب ہم نے اپنے استاد حسین نقی کی ہدایت پر پان کھانا بہت کم کر دیا ہے۔ لیکن کیا کریں چھٹتی نہیں یہ کافر منھ کو لگی ہوئی۔ ایک دن ہم ایک پان کی دکان سے پان لے رہے تھے کہ پاس کھڑے ایک نوجوان نے جو کبھی کبھار وہاں نظر آتے تھے، ہمیں دیکھ کر کہا کہ آپ لکھتے بھی ہیں؟ مجھے ایسا لگا کہ وہ غالباً کہنا چاہ رہا تھا کہ لکھتے ہیں اور پان بھی کھاتے ہیں۔

خیر ہم نے کہا کہ بس لکھ لیتے ہیں۔ ہم سمجھے اُنھوں نے ڈان ڈاٹ کام پر ہمارا کوئی بلاگ پڑھ لیا ہوگا۔ یا ہماری کتاب ''تیسری جنس'' اُن کی نظر سے گزری ہوگی۔ لیکن اگلے لمحے ہی اُس نوجوان نے ہمیں چونکا دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کی فاطمہ جناح پر کتاب بہت اچھی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ نوجوان نے اصرار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ کتاب میں آپ کی تصویر بھی ہے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ کتاب کی کوئی کاپی اُس کے پاس موجود ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! میں نے پڑھ لی ہے۔ کیا آپ کو چاہیے؟ میں نے کہا بالکل چاہیے۔ انھوں نے اگلے دن ایک بجے کا وقت دیا۔ ہم نے وہ رات کیسے گزاری یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اگلے دن ایک بجے پان کی دُکان پر پہنچے اور اس نوجوان کے بارے میں پان والے سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں سے جا چکے ہیں۔ ہمارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی ہم مایوس ہو گئے۔ اچانک پان والا بولا کہ یہ کتاب وہ آپ کے لیے دے کر گیا ہے۔ یہ کتاب نہیں کتابچہ تھا۔ کتاب کے عنوان نے ہمیں حیران کر دیا یہ ہمارے ایک بلاگ کا عنوان تھا۔ ''قصہ فاطمہ جناح کی تدفین کا''۔ اتنا ہی کافی تھا ہمارے

لیے۔ پان کی دکان سے پریس کلب تک کا 5 کلومیٹر کا فاصلہ کیسے طے ہوا، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ کلب پہنچ کر کتابچے کا بہ غور جائزہ لیا۔ چار رنگوں کا سرِ ورق جس پر فاطمہ جناح کی خوب صورت تصویر اور پسِ ورق پر پاکستان کا نقشہ سبز ہلالی پرچم میں سمویا ہوا تھا۔ نقشے کے آخر میں مزارِ قائد کی تصویر اور سرِ ورق پر ''قصہ فاطمہ جناح کی تدفین کا'' کے اوپر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

''پاکستان بنانے والوں کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا؟ ہم کتنے محسن کُش ہیں جانیے۔''

کتاب چہ میں پہلا بلاگ قصہ فاطمہ جناح کی تدفین کے عنوان سے ہے۔ دوسرے بلاگ کا عنوان ''فاطمہ جناح اور ریڈیو کے فرمان بردار ٹرانسمیٹر'' ہے۔ تیسرے بلاگ کا عنوان ''قائدِ اعظم کی زندگی کے گم شدہ اوراق'' ہے۔ یہ کتاب چہ 36 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام بلاگ آپ ڈان ڈاٹ کام اردو اور انگلش پر پڑھ چکے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ کتاب چے پر شائع کرنے والے اور تقسیم کار کا نام موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ پرنٹر کا نام بھی نہیں ہے۔ جن صاحب نے یہ چھاپا ہے ان کی نیک نیتی پر کوئی شک نہیں ہے۔ وہ یقیناً یہ چاہتے ہوں گے کہ جو لوگ ان معلومات سے محروم رہے ہیں ان تک بھی یہ معلومات پہنچا دی جائیں۔ یہ ایک اچھا عمل ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس میں لکھنے والے کا کوئی حوالہ ہوتا اور اگر ہمارا نام بھی چھاپ دیا جاتا تو کیا بُرائی تھی؟ ہمارے ساتھی محسن سُومرو نے ہمیں بتایا کہ تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود کتاب چے کے صفحہ نمبر 11 اور 12 پر دوبار ہمارا نام چھپ گیا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ صفحہ نمبر 33 پر شریف المجاہد کا انٹرویو کرتے ہوئے ہماری تصویر بھی چھپ گئی ہے۔ جناح صاحب یا ایسی دوسری شخصیات، تاریخی مقامات اور مذہبی عبادت گاہوں سے متعلق ہمارے تمام بلاگ قابلِ اشاعت ہیں اور ہم ان میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی کرتے ہیں کیوں کہ ''تغیر کو ہے ثبات اک زمانے میں''۔ ہم قلم کے مزدور ہیں اور جن اداروں کے لیے لکھتے ہیں وہ ہمیں اس کی مزدوری بھی ادا کرتے ہیں۔ جو دوست ہمارا بلاگ چھاپتے ہیں اور حتیٰ کہ کتابی صورت میں بھی چھاپتے ہیں اُن سب کو یہ مشورہ ہے کہ آئندہ اگر وہ اس طرح کی نیکی کا کام کریں تو ہم سے مشورہ ضرور کریں۔ لیکن یہ مشورہ با معاوضہ ہوگا بلا معاوضہ نہیں۔

❋

قراردادِ پاکستان
23 مارچ یا 24 مارچ؟

پاکستان کی سیاسی تاریخ ایک ایسی تاریخ ہے جس میں حقائق کم اور مغالطے و مبالغے زیادہ پائے جاتے ہیں، ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مضامین کے ذریعے تاریخ کے چہرے پر سے ان مغالطوں اور مبالغوں کی گرد ہٹائی جائے مثلاً پاکستان کی تاریخ پیدائش 14 کے بجائے 15 اگست ہے یا محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب مائی برادر کے دو صفحے غائب کیے گئے۔

اس مضمون کا موضوع 23 مارچ کی قراردادِ پاکستان ہے، لیکن متعدد حوالے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ قرارداد 24 مارچ 1940 کو منظور کی گئی تھی۔ قراردادِ لاہور کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ برِصغیر میں بسنے والے مسلمانوں نے منٹو پارک کے مقام پر ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے 1940 کے سالانہ اجلاس میں اپنے لیے ایک الگ خطے کے مطالبے کی قرارداد منظور کی تھی، جو بعد ازاں قراردادِ پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ قراردادِ پاکستان کے قیام کی بنیاد قرار دی جاتی ہے۔

ایک عام پاکستانی کے لیے تاریخ کے ماخذ یا تو درسی کتابیں ہیں یا پھر وہ غیر سرکاری مصنفین کی تصانیف جو درسی کتابوں کا ہی پرتو سمجھی جاتی ہیں، ان میں درج حوالوں کے سبب ہی ایک عام پاکستانی 23 مارچ کی تاریخ کو قراردادِ پاکستان یا قراردادِ لاہور کی منظوری کی تاریخ سمجھتا ہے۔

اگر برِصغیر کے اس اہم تاریخی واقعے کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی

ہے کہ قراردادِ پاکستان 23 مارچ کو نہیں بلکہ 24 مارچ کو منظور ہوئی تھی۔ یہ معاملہ مزید دلچسپ اس لیے بھی ہے کہ یہ تاریخی قرارداد 24 مارچ کو بھی اس وقت منظور ہوئی جب عیسوی کلینڈر کی تاریخ بدلنے میں فقط نصف گھنٹہ رہ گیا تھا، یعنی یہ قرارداد 24 مارچ 1940 کو رات ساڑھے 11 بجے منظور کی گئی تھی۔

اس سے قبل 1938 میں بھی اسی طرز کی ایک قرارداد کراچی میں منظور کی گئی تھی۔ 1938 اور 1940 کی قراردادوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ 1938 والی قرارداد میں ایک الگ وطن کی بات کی گئی تھی جبکہ 1940 میں ایک سے زائد ریاستوں کا ذکر تھا۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ 1938 کی قرارداد کو 1940 کی قرارداد جتنی اہمیت کیوں حاصل نہ ہو سکی؟ قراردادِ لاہور سے 2 سال قبل کراچی کے عیدگاہ میدان میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زیرِ صدارت سندھ صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں برِ صغیر کے تمام سرکردہ مسلم رہنماں نے شرکت کی۔ قائدِ اعظم اکیڈمی کراچی کی مطبوعہ 1989 سندھ صوبائی لیگ کانفرنس 1938: پس منظر و اہمیت کے مطابق اس کانفرنس میں شیخ عبدالمجید سندھی نے ایک طویل قرارداد پیش کی جس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا، قرارداد کے متن کا آخری حصہ یوں تھا:

''یہ کانفرنس برِاعظم) ہندوستان (میں دائمی امن اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی آزادی کے ساتھ ثقافتی ترقی، اقتصادی و سماجی بہبودی اور سیاسی خود ارادی کے مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ تجویز دینا انتہائی ضروری سمجھتی ہے کہ وہ اس بات پر از سرِ نو غور کرے کہ ہندوستان کے لیے کون سا آئین مناسب ہوگا جس کے ذریعے دونوں قومیں اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں اور ایک ایسا آئینی منصوبہ تیار کرے جس کے تحت مسلمان قوم مکمل طور پر آزادی حاصل کر سکے۔''

یہ تھا کچھ احوال سندھ کے شہر کراچی کے عیدگاہ گراؤنڈ میں منظور ہونے والی قرارداد کا، آیئے اب دوبارہ رخ کرتے ہیں اپنے اصل موضوع یعنی قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان کی

طرف۔

قراردادِ لاہور 24 مارچ کو منظور ہوئی، جو مختلف تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں قیامِ پاکستان سے قبل تحریکِ پاکستان اور بعد از قیام ملک کی قومی تاریخ پر کے کے عزیز کی تصنیف 'تاریخ کا قتل Murder of History' ایسے ہی کچھ خود ساختہ تاریخی مغالطوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ کے کے عزیز اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 142 پر قراردادِ پاکستان کی منظوری کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں

'آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی کارروائی 22 مارچ 1940 کو شروع ہوئی۔ نواب ممدوٹ نے استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ کے طور پر افتتاحی خطاب کیا۔ جناح صاحب نے فی البدیہہ طویل تقریر کی اور اس کے ساتھ ہی اس دن کی کارروائی اختتام کو پہنچی۔ 23 مارچ 1940 کو اجلاس کی کارروائی 3 بجے سہ پہر شروع ہوئی۔ بنگال کے وزیر اعظم اے کے فضل حق نے قراردادِ لاہور پیش کی اور اس کی حمایت میں تقریر کی۔ چوہدری خلیق الزمان نے اس قرارداد کی تائید کی اور مختصر سا خطاب کیا۔

اس کے بعد ظفر علی خان، سردار اورنگزیب خان اور عبداللہ ہارون نے قرارداد کی تائید میں مختصر تقاریر کیں، اجلاس کی کارروائی کو اگلے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ 24 مارچ کو اجلاس کی کارروائی دن کے سوا 11 بجے شروع ہوئی۔ متحدہ صوبہ جات کے نواب محمد اسماعیل خان، بلوچستان کے قاضی محمد عیسیٰ اور عبدالحمید خان آف مدراس نے قراردادِ لاہور کے حق میں تقاریر کیں۔

اس موقع پر جناح صاحب اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے جو صبح کے وقت کچھ دوسرے اہم نوعیت کے کاموں میں مصروف تھے۔ جناح صاحب نے اسٹیج پر پہنچ کر کرسی صدارت سنبھالی اور قرارداد کے حق میں تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ بمبئی کے اسماعیل ابراہیم چندریگر، وسطی صوبہ جات کے سید عبدالرؤف شاہ اور پنجاب کے ڈاکٹر محمد اسلم نے قرارداد کی حمایت میں بڑی پرجوش تقاریر کیں۔ اس موقع پر جناح صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے عبدالرحمان صدیقی کو فلسطین پر قرارداد پیش

کرنے کی ہدایت کی۔ سید رضا علی اور عبدالحمید بدایونی نے اس قرارداد کی تائید میں تقاریر کیں۔

جس کے بعد اجلاس کی کارروائی کو رات 9 بجے تک ملتوی کر دیا گیا۔ رات کو میٹنگ شروع ہوئی تو سید ذاکر علی اور بیگم محمد علی اس قرارداد کے حق میں بولے اور پھر قرارداد کو رائے شماری کے لیے اجلاس میں پیش کیا گیا جسے اجلاس کے شرکا نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ اس کے فوراً بعد خاکساروں اور جماعت کے آئین میں تبدیلی کے سلسلے میں مزید 2 قراردادیں پیش کی گئیں اور انھیں بھی فوراً منظور کر لیا گیا۔ بعد ازاں اگلے سال کے لیے جماعت کے عہدے داروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا اور جناح صاحب نے ایک مختصر سا خطاب کیا۔ جب اجلاس کا اختتام ہوا تو گھڑی کی سوئیاں رات کے ساڑھے 11 بجے کا اعلان کر رہی تھیں۔

اگر قرارداد کی منظوری میں آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تو یہ قرارداد 24 کے بجائے 25 مارچ کو منظور ہوتی۔ کے کے عزیز اجلاس کی لحہ بہ لحہ کارروائی کو قلم بند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں ذرا سا بھی شائبہ نہیں کہ قراردادِ لاہور 24 مارچ 1940 کو منظور ہوئی تھی۔

احمد سلیم شیخ کی کتاب انسائیکلوپیڈیا تحریکِ پاکستان مطبوعہ 2011 بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ قراردادِ لاہور 23 مارچ کے بجائے 24 مارچ کو منظور ہوئی تھی۔

احمد سلیم شیخ اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ قراردادِ لاہور 24 مارچ 1940 [illegible]ر ہوئی لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ چونکہ قرارداد 23 مارچ کو پیش کی گئی تھی اس لیے یہ دن 23 مارچ کو منایا جاتا ہے۔

محمد الیاس اپنی کتاب جدوجہدِ پاکستان میں لکھتے ہیں کہ:

ابتدائی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ قرارداد مولانا ظفر علی خان پیش کریں گے مگر بعد میں قائدِ اعظم نے فیصلہ کیا کہ قرارداد بنگال کے وزیرِ اعظم اے کے فضل حق پیش کریں۔ 23 مارچ 1940 کو یہ قرارداد پیش کی گئی۔ قرارداد کی حمایت میں تقریروں کا سلسلہ جاری تھا کہ نماز کا وقت آ گیا اور اگلے دن تک اجلاس کو ملتوی کر دیا گیا۔ 24 مارچ کو پھر اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس دن اجلاس میں سید ذاکر علی، ڈاکٹر محمد عالم، عبدالحمید خان، سید عبدالرؤف شاہ، اسماعیل ابراہیم چندریگر، نواب محمد

اسماعیل، بیگم محمد علی، مولانا عبدالحمید بدایونی اور قاضی محمد عیسیٰ نے قرارداد کی حمایت میں تقاریر کیں، تاہم اس کے بعد مصنف داستان ادھوری چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ قرارداد کی منظوری کا کیا بنا۔

قارئین کے لیے یہ حقیقت بھی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ تحریک پاکستان کے بعض سرگرم رہنما بھی اس مغالطے کا شکار رہے کہ قراردادِ لاہور 24 مارچ کے بجائے 23 مارچ کو منظور ہوئی۔ یہاں جی الانہ کی کتاب قائدِ اعظم: ایک قوم کی سرگزشت کی ہی مثال لیجیے، جی الانہ معروف اسکالر اور قائدِ اعظم کی سوانح عمری لکھنے والے اہم مسلم لیگی رہنما تھے، وہ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 385 پر لکھتے ہیں کہ:

23 مارچ 1940 کو لاہور میں اس قرارداد کی منظوری سے ہندو اور کانگریس دہل کر رہ گئے۔ انھیں نوشتہ دیوار نظر آ رہا تھا اور انھیں یقین ہوگیا تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کو خودمختار ریاستوں میں تقسیم کرنے کی وکالت کر رہی ہے۔ ہندوؤں اور کانگریس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی، ہندو اخباروں نے قرارداد کی مذمت میں ان گنت اداریے لکھ مارے۔

ہم نے جب اس سلسلے میں معروف دانش ور اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے سابق سیکریٹری جنرل آئی اے رحمان سے بات کی تو انھوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ قراردادِ لاہور 23 مارچ کے بجائے 24 مارچ کو منظور ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ 1956 میں پاکستان کا پہلا آئین فروری کے مہینے میں آئین ساز اسمبلی سے منظور ہوا اور 23 مارچ 1956 کو نافذ العمل ہوا۔ 23 مارچ کو اس آئین کے نافذ ہونے کے بعد پاکستان میں قراردادِ لاہور کی منظوری بھی 23 مارچ کے طور پر منائی جانے لگی۔

ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری 'جدوجہدِ آزادی میں سندھ کا کردار' میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے قیام کی حمایت میں جہاں قراردادِ لاہور تاریخی اہمیت کی دستاویز ہے وہیں یہ تاریخی واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ تحریکِ پاکستان میں ایک ایسا موقع بھی آیا جب انگریزوں نے قائدِ اعظم سے کہا کہ وہ مسلم اکثریت والے کسی بھی صوبے سے اپنی اکثریت کا ثبوت دیں۔ یہ

ایک ایسا نازک مرحلہ تھا جہاں قائدِ اعظم کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ جدوجہدِ آزادی میں سندھ کا کردار کے صفحات 362 اور 363 پر لکھتے ہیں کہ:

''قائدِ اعظم نے بنگال کے وزیرِ اعظم سر فضل الحق سے رابطہ کیا، پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات سے رابطہ قائم کیا اور اسی طرح صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ خان صاحب سے بھی رابطہ قائم کیا مگر کہیں سے بھی پاکستان کے حق میں قرارداد کے منظور ہونے کی امید نظر نہ آئی، اب قائدِ اعظم نے صوبہ سندھ پر اپنی امید کی نظر رکھی اور سندھ کے مسلم لیگی رہنماؤں سے رابطہ کیا۔''

جبار عابد لغاری مزید لکھتے ہیں کہ، یہ 3 مارچ 1943 کا دن تھا جب جی ایم سید نے سندھ اسمبلی میں قراردادِ پاکستان پیش کی۔ اس قرارداد کے مطابق:

''ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، جن کا علیحدہ مذہب، فلسفہ، سماجی رسومات، ادب وروایات اور سیاسی واقتصادی نظریات ہیں۔ وہ ہندوں سے بالکل مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی وہاں اپنی علیحدہ آزاد قومی ریاست ہو، جہاں وہ ہندوستان کے علاقوں میں اکثریت رکھتے ہیں۔''

جی ایم سید کی اس قرارداد کا ذکر ہمیں خال خال ہی نظر آتا ہے ماسوائے اس کے کہ اس کا متن سندھ اسمبلی میں داخل ہوتے ہی دیوار پر آویزاں ہے۔ گمان ہے کہ شاید ہی کسی اسمبلی ممبر نے کبھی اس کو پڑھا ہو۔

قراردادِ لاہور کا اصل متن اور بعد ازاں تاریخ کی نصابی وغیر نصابی کتابوں میں اس کے متن کے ساتھ کی جانے والی تحریف ایک ایسا موضوع ہے جو ہمیشہ سے غیر جانبدارانہ تحقیق کرنے والوں اور سرکاری نقطۂ نظر رکھنے والوں کے درمیان وجہ بحث بنا رہا ہے۔

پاکستان میں اسکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک پڑھائی جانے والی تاریخ کی کتابوں، سرکاری دستاویزات اور حکومتی زعما کی زبانوں سے یہ الفاظ پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں کہ قراردادِ لاہور جو بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے معروف ہوئی، اس میں مسلمانانِ برِ صغیر کے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کے کے عزیز کی کتاب تاریخ کا قتل کے مطابق آل انڈیا مسلم لیگ کی شائع کردہ باقاعدہ لاہور قرارداد کا متن کچھ یوں تھا:

آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس نہایت غور وفکر کے بعد اس ملک میں صرف اسی آئین کو قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول قرار دیتا ہے جو جغرافیائی اعتبار سے باہم متصل خطوں کی صورت میں حد بندی کا حامل ہو اور بوقتِ ضرورت ان میں اس طرح ردو بدل ممکن ہو کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت بہ اعتبار تعداد ہو جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے ہیں، انھیں آزاد ریاستوں کی صورت میں یکجا کر دیا جائے اور ان میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور حاکمیت کی حامل ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا وجہ تھی جس کے سبب 24 مارچ 23 مارچ ہو گیا۔ یہ عقدہ اس وقت کھلا جب ہماری بات معروف کالم نویس اور سابق چیئرمین واپڈا ظفر محمود سے ہوئی۔

ان کے مطابق پاکستان میں آئین سازی کا عمل 1956 میں مکمل ہوا، وزیرِ اعظم چوہدری محمد علی نے گورنر جنرل سے آئین کی باقاعدہ منظوری کے لیے تاریخ مانگی، گورنر جنرل نے 23 مارچ کا دن چنا، 1940 سے لے کر 1947 تک اور آزادی کے بعد بھی 23 یا 24 مارچ کا دن سرکاری طور پر منایا نہیں جاتا تھا اور نہ ہی تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں تعطیل ہوا کرتی تھی۔

گورنر جنرل آفس نے 23 مارچ کا دن کسی خاص سبب سے نہیں بلکہ اتفاقاً چنا، گورنر جنرل سے ایک تاریخ موصول ہونے کے بعد وفاقی کابینہ کا اجلاس ہوا اور آئین کی منظوری کے دن کو یومِ جمہوریہ یا Republic Day کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا، کابینہ کے اُس اجلاس میں قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان کا ذکر نہ تھا۔

1956 کے بعد 1957 اور 1958 کو بھی 23 مارچ یومِ جمہوریہ کے طور پر منایا گیا، جب اکتوبر 1958 کے مارشل لا کے بعد آئندہ برس کا 23 مارچ کا دن نزدیک آنے لگا، تو کابینہ نے فیصلہ کیا کہ اس دن کو یومِ جمہوریہ کے بجائے یومِ پاکستان کے طور پر منایا جائے گا، یہ وقتی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد 1956 کا آئین منسوخ ہو چکا تھا اور نئے آئین کے مسودے پر کام جاری تھا۔

ان دنوں 14 اگست یومِ پاکستان کے طور پر منایا جاتا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ 23 مارچ کو یومِ پاکستان اور 14 اگست کو یومِ آزادی کے عنوان سے موسوم کیا جائے۔ چند سال کے بعد مارشل لا اٹھالیا گیا مگر 23 مارچ کا دن یومِ جمہوریہ کے بجائے یومِ پاکستان کے طور پر منایا جاتا رہا حالانکہ 1962 اور بعدازاں 1973 کے آئین پاکستان کے تحت پاکستان کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب تک لکھا جا رہا ہے لیکن بدقسمتی سے اسے استعمال کرنے والے اپنے اپنے انداز میں اپنے نظریات کی بنیاد پر دلائل دیتے ہیں۔ اس کے لیے ایک وسیع مطالعے اور تحقیق کی ضرورت ہے، قراردادِ لاہور کے مندرجات ہمارا موضوع نہیں بلکہ ہماری تو بس اتنی سی بحث ہے کہ یہ قرارداد کس تاریخ کو منظور ہوئی تھی؟

❊

درویش کا قتل

بھگت کنور رام، تقسیم سے قبل سندھ کی ایک ایسی ہستی تھے جنھوں نے سماج سیوا میں کوئی بھید بھاؤ نہ کیا اور نہ ہی ہندو مسلم کی تفریق رکھی۔ وہ ایک عظیم موسیقار اور گلوکار تھے۔ لوگ ان کا کلام سننے کے لیے جوق در جوق پہنچتے تھے اور ہزاروں روپے ان پر نچھاور کرتے تھے۔ لیکن محفل کے اختتام کے بعد بھگت کنور رام وہ تمام رقم ہندو اور مسلمان ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔ انھیں 1939 میں ایک مسلمان مذہبی پیشوا کے پیروکاروں نے قتل کردیا تھا۔ سینئر صحافی، ادیب، محقق اور دانشور شیخ عزیز کے مطابق جس وقت قاتل انھیں قتل کرنے وہاں پہنچے تو ان کے کسی چاہنے والے نے سنتروں کا ایک ٹوکرہ انھیں تحفتاً دیا تھا۔ انھوں نے خوش دلی سے قاتلوں کا استقبال کیا اور انھیں اپنے ہاتھوں سے سنترے چھیل کر کھانے کے لیے دیے۔

تیرتھ وسنت 1940 میں مطبوعہ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ:

کنور غریب محنت کش کے بیٹے تھے۔ لیکن خدا نے انھیں بہت نوازا تھا۔ بھگتی سے لاکھوں کمائے، لیکن پیتل کا ایک سکہ بھی اپنے آپ پر خرچ نہ کیا۔ پرچون کا روزگار کرتے تھے۔ چلو بھر خون دے کر، چلو بھر چاول لیتے تھے، لیکن حرام کا پیسہ غریبوں میں بانٹنا مہا پاپ سمجھتے تھے۔ بھگت اگر اپنی کمائی اپنے آپ پر خرچ کرتے تو کیا حرج تھا، لیکن وہ سرمایہ امانت سمجھ کر غریبوں میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔ کنویں کھدوانا، غریب لڑکیوں کی شادیاں کروانا، اندھے، لنگڑے لولوں کی فلاح و بہبود کا بندوبست کرنا، گئوشالا کے لیے فنڈز دینا فرض گردانتے تھے۔ کئی ہندو اور

مسلمان خاندان ان کے دان پر پلتے تھے۔ مسلمانوں سے اتنی محبت تھی کہ بڑے بڑے وڈیرے سردار گھریلو اختلافات سُلجھانے ان کے پاس آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی اس مجسم تصویر کو گورنر نے 1937 میں شال اوڑھائی۔ وہ غریب مسلمانوں کے قرض ادا کرتے، عدالتوں سے ان کے مقدمات خارج کرواتے تھے۔ بھگت کنور رام کہتے تھے 'بیچارے زمین داروں کی بھٹیوں اور سود خوروں کے سود میں پس رہے ہیں۔' وڈیروں سیٹھوں سے محبت کا رشتہ تھا، لیکن سرمایہ داری، زمین داری کی سرپرستی کے وہ حامی نہیں تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ دولت مندوں کے دماغ میں حضرت فلوس اور آنتوں میں ابلیس کا ڈیرہ ہے۔ البتہ اُن کا طرزِ علاج قدیم مگر بے اثر تھا۔ بھگتی میں بھوکے مانگتے، سود خوروں کے لیے اُن کا کہنا تھا کہ 'سود خور ایسے ڈربے کی مانند ہیں جس میں آس پاس کا برساتی پانی آکر جمع ہوتا ہے، دوستو۔ دان ہے پرنالہ، جس سے اگر پانی بہے گا تو ڈربا خود بخود ڈھے جائے گا۔'

سندھ کے معروف مورخ اور دانشور لوک رام ڈوڈیجا اپنے ایک مضمون ''سندھی ثقافت کا ایک مجسم روپ'' میں بھگت کنور رام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

ان کے بارے میں کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں، وہ سندھی ثقافت کی ایک عملی شکل تھے۔ بھگت راہ چلتے خدا کے نام پر جھولی پھیلاتے تھے تو ہزاروں روپے جمع ہوجاتے تھے جو وہ موقع پر ہی فقیروں، مسکینوں، محتاجوں اور عورتوں میں تقسیم کردیتے تھے۔ کوئی بھی سوالی ان کے در سے خالی نہ جاتا تھا۔ ایک بار جب وہ ساری رقم تقسیم کرچکے تو ایک سوالی کپڑے لینے کے لیے آیا تو انھوں نے دھوتی باندھ کر اپنے کپڑے اتار کر اسے دے دیے۔ تب میں نے کہا 'بھگت صاحب، یہ تو گھاٹے کا سودا ہے' جواباً وہ بولے 'دوست، میں اب بھی گھاٹے میں نہیں، جہاں میں برہنہ آیا تھا، ابھی تو دھوتی ہے۔' ایسے تارک الدنیا مہاتما کو میرا

بار بار پرنام!

بھگت کنور رام کے متعلق وہ اپنی سوانح حیات، کے دُوسرے حصے ''سیف و قلم'' کے صفحہ نمبر 153 سے 155 تک رقم طراز ہیں کہ:

زیادہ نیک ہونا بھی جُرم ہے

مہاتما گاندھی کا جب قتل ہوا، تو برطانیہ کی مشہور اور قابلِ احترام شخصیت مسٹر برنارڈ شا نے اس خبر کو سنتے ہی کہا تھا:

''زیادہ نیک ہونا بھی جُرم ہے''۔

یعنی مہاتما گاندھی ایک فرقہ پرست اور متعصب شخص کے ہاتھوں قتل نہ ہوتے، اگر آپ کا دل اور دماغ فرقہ پرستی کے جراثیم سے قطعی پاک نہ ہوتا، اور آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک نظر سے نہ دیکھتے۔ زیادہ نیک ہونے کے جرم کے سلسلے میں واقعات سنیے:

میں جس زمانے میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا، اور آنکھوں کے آپریشن کرنے کے سلسلے میں سندھ کے ایک مقام میرپور ماتھیلو (ضلع سکھر) میں مقیم تھا، تو ایک روز اُس قصبے میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر شخص کی زبان پر بھائی کنور کا نام تھا اور ہر کوئی منتظر تھا کہ رات کو بھائی کنور رام کا رقص اور گانا ہوگا۔ اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ بھائی کنور کون ہے۔ رات کو دس بجے کے قریب قصبے کے لوگوں نے اس جگہ پر پہنچنا شروع کیا جہاں بھائی کنور گانے والے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ میں بھی بھائی کنور کا گانا سننے چلا گیا۔

بھائی کنور ایک درویش صفت صوفی تھے۔ آپ سندھ کے دیہات، قصبوں اور شہروں کا دورہ کرتے۔ آپ کے ساتھ سو ڈیڑھ سو کے قریب آپ کے مداح اور معترف ہوا کرتے۔ ہر مقام پر دو تین روز قیام کرتے اور پھر اگلے قصبے، شہر

یا گاؤں چلے جاتے۔ ہر مقام کے لوگ آپ کو پہلے گاؤں قصبے یا شہر سے لینے آتے اور بعد میں دوسرے مقام پر چھوڑ آتے۔ آپ جتنے روز قیام کرتے، ہزار ہا لوگ ایک ہی لنگر میں کھانا کھاتے اور ہر روز رات کے وقت آپ کا رقص اور گانا ہوتا۔ میں جب بھائی کنور (جن کو اکثر لوگ بھگت کنور بھی کہتے تھے) کی مجلس والی جگہ پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ وہاں ہزار ہا ہندو اور مسلمان جمع ہیں۔ گیس کی روشنی کے ہنڈے جل رہے ہیں۔ بھائی کنور کے پاؤں میں گھنگھرو بندھے ہیں اور آپ کھڑے ہو کر سازوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ اس رقص کے ساتھ گرونانک، کبیر، خواجہ فرید، سورداس، تلسی داس اور سندھ کے مسلمان صوفیوں کا کلام گایا جا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ بھائی کنور موسیقی کے فن سے تو زیادہ واقف نہ تھے مگر آپ کے گلے میں اس قدر اثر تھا کہ وہاں ہر شخص جھوم رہا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ دنیا کے لالچ سے قطعی بلند رہتے ہوئے صرف بطور ایک مشنری کے صوفی ازم کی تبلیغ کے لیے ایسی محفلیں منعقد کرتے، اور جب آپ رقص کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ میرا بائی پریم کے رنگ میں رنگی ہوئی شری کرشن کے سامنے رقص کر رہی ہے۔

بھائی کنور کی یہ محفل رات کو نو دس بجے سے شروع ہو کر سورج طلوع ہونے تک جاری رہتی۔ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس محفل کو چھوڑ سکا ہو یا جس نے چند منٹ کے لیے بھی اس محفل سے جانا گوارا کیا ہو۔ چناں چہ راقم الحروف بھی صبح تک بھائی کنور کا گانا سننے اور رقص سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں موجود رہا۔ حالانکہ مجھے کسی مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں اور تصوف کو بھی میں ایک مذہب ہی سمجھتا ہوں۔

بھائی کنور کے میر پور ماتھیلو کے اس گانے اور رقص کے بعد ان کی کشش مجھے روہڑی اور ڈہرکی بھی لے گئی جہاں ان کی محفل منعقد ہوئی اور میں آپ کے گانے

اور رقص کو اب تک نہیں بھول سکا۔ اگر کبھی ریڈیو سے بھائی کنور کے گانے کا ریکارڈ سن لیتا ہوں تو اپنے جسم میں حظ اور لطف کا ایک کرنٹ سا محسوس کرتا ہوں۔''

بھائی کنور کے متعلق ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ عام طور پر ہندوؤں کے مندروں اور مسلمان فقراء کی درگاہوں کے سامنے اپنے رقص کی محفلیں منعقد کرتے کیونکہ ہندو اور مسلمان صوفیوں سے آپ کو ایک قسم کا عشق تھا۔

آپ ایک بار امرتسر گئے تو آپ نے چاہا کہ آپ وہاں دربار صاحب میں بھی رقص کریں اور گرو صاحبان کا کلام گائیں مگر گردوارے کے منتظم اکالیوں نے آپ کو اس کی اجازت نہ دی۔ اس انکار سے آپ بہت مایوس اور بددل ہوئے تو آپ نے دربار صاحب کے بالکل قریب گھنٹہ گھر کے پاس ہی اپنا رقص شروع کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہزارہا لوگ آپ کا کیرتن یعنی گانا سننے اور رقص دیکھنے جمع ہو گئے اور آپ کی بلند اور پرکشش آواز دربار صاحب تک پہنچتی رہی۔

بھائی کنور زندگی بھر اسی طرح دیہات، قصبات اور شہروں کا دورہ کرتے رہے۔ جب بھی سفر کرتے، آپ کے ہمراہ ڈیڑھ سو معتقدین کا ایک قافلہ ہوتا۔ پبلک کے دلوں میں آپ کے لیے عزت واحترام کے جذبات کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ریلوے کے ملازموں کی خواہش ہوتی کہ قافلے کے لوگ ریلوے کا ٹکٹ نہ خریدیں۔ بھائی کنور کبھی اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے سفر نہ کرتے اور یہ دورہ صرف پبلک مفاد کے لیے ہوتا۔ بھائی کنور کسی شخص کو بھی بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

بھائی کنور زندگی بھر اپنے مشن میں مصروف رہے اور آخر آپ ایک روز ریلوے اسٹیشن سکھر پر ایک متعصب مُلا ٹائپ مسلمان کے ہاتھوں اسی طرح قتل کردیے گئے جس طرح گارڈ نے مہاتما گاندھی کو قتل کیا تھا کیونکہ بقول مسٹر برنارڈ شا دنیا

میں زیادہ نیک ہونا بھی ایک جرم ہے۔

معروف صحافی رضا علی عابدی اپنی کتاب ریل کہانی میں رُک اسٹیشن کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"رُک: جہاں کوئی نہیں رُکتا"

سکھر سے یہی کوئی چوبیس پچیس کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گمنام اسٹیشن ہے: رُک۔ اگر انگریزوں کا خواب پورا ہو جاتا اور قدرت کو منظور ہوتا تو اس جگہ ایشیاء کا ایک عظیم الشان اسٹیشن ہوتا: رُک جنکشن۔ پورے برصغیر سے مسافر یہاں آیا کرتے اور ریل گاڑیوں میں بیٹھ کر اندرونِ سندھ کے اسٹیشن سے قندھار، کابل، وسطی ایشیا اور یورپ جایا کرتے۔ مگر یہ خواب ادھورا ہی رہا۔ رُک جنکشن سکڑ کر چھوٹا سا بھولا بسرا اسٹیشن رہ گیا۔ اب وہاں سست رفتار پسنجر گاڑیاں رکتی ہیں جس کے مسافر کھڑکیوں سے باہر دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اسٹیشن کی اتنی بڑی اور دل کش عمارت، اتنے لمبے لمبے پلیٹ فارم اور دھوپ سے بچانے والے نہایت خوش نما سائبان اس ویرانے میں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی اپنے دوسرے نصف میں تھی کہ ہندوستان میں 'روس آیا، روس آیا' کا شور اُٹھا۔ خیال تھا کہ روسی فوجیں ڈنکے بجاتی ہوئی کوئٹہ کے راستے ہندوستان میں وارد ہوں گی اور جب تک بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں میں غسل نہیں کر لیں گی، چین سے نہیں بیٹھیں گی۔

۱۸۷۶ء میں حکم ہوا کہ جیسے بھی بنے، رُک سے نئی لائن نکالی جائے جو قندھار کی طرف چلے۔ ۱۸۷۹ء میں کابل میں انگریزوں کا قتلِ عام ہوا تو نیا حکم جاری ہوا کہ رک سے بی تک یہ لائن راتوں رات ڈالی جائے۔ ہندوستان کی تمام ریلوے کمپنیوں نے اپنا مال اسباب اُٹھا کر انجینئروں کے حوالے کر دیا۔ چناں چہ ۲/ اکتوبر ۱۸۷۹ کو رک سے بی کی طرف جانے والی پہلی پٹری بچھائی گئی۔ اس

کے بعد آندھی اور طوفان کی طرح کام ہوا اور دو سو بیس کلو میٹر سے زیادہ لمبی یہ لائن صرف ایک سو ایک دنوں میں ڈال دی گئی۔ مختلف مقامات خود جا کر دیکھنے کی ہوک تو اکثر اُٹھتی ہے لیکن جیسا اشتیاق رُک کا یہ اسٹیشن دیکھنے کا ہوا اس کا حال نہ پوچھیے۔ میرے پاس پاکستان کے جتنے بھی نقشے ہیں ان میں رُک کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر میں نے روہڑی اسٹیشن کے سُپر نٹنڈنٹ عرفان حسین فاروقی صاحب کو جو اس سفر کے دوران میرے دوست بن چکے تھے، ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ کیا آپ کے علاقے میں رُک نام کا کوئی اسٹیشن ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہ صرف ہے بلکہ نہایت دل کش ہے اور دیکھنے کی جگہ ہے۔

جب میں کراچی پہنچا تو ریلوے کے اپنے ایک دوست، اعلیٰ انجینیر یعقوب علی زرداری صاحب سے کہا کہ سکھر کے قریب کوئی اسٹیشن ہے: رُک۔ وہاں جا کر اسے دیکھنا ممکن ہے؟ میرا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور سکھر کے ریلوے کے اعلیٰ انجینیر جلال الدین ابڑو صاحب سے بزبانِ سندھی گفتگو کرنے کے بعد مجھ سے کہا: لیجئے مبارک ہو۔ ابڑو صاحب خود ،رُک کے باشندے ہیں اور انھوں نے آپ کو رُک لے جانے کے سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ اگلے ہی روز پی آئی اے کا پنکھوں سے چلنے والا چھوٹا فوکر طیارہ سکھر کی جانب پرواز کر رہا تھا اور اس کے سارے مسافروں میں اگر کوئی مضطرب تھا تو وہ میں تھا، میری چشم تصور ایک تاریخی ریلوے اسٹیشن کی سو طرح کی تصویریں بنا رہی تھی، منا رہی تھی کہ دریا کے چوڑے پاٹ پر اپنا سایہ ڈالتا ہوا طیارہ شہروں کے اوپر اڑتا ہوا سکھر کی سرزمین پر اتر گیا۔

جلال الدین ابڑو صاحب وہیں میرے منتظر تھے۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے: پہلے سکھر چلیں گے یا رُک؟ میں نے زبانِ اردو کی تاریخ کا مختصر ترین جواب دیا: رُک

ہماری جیپ سکھر بیراج سے نکلنے والی تین متوازی نہروں کے کنارے ایک پشتے کے اوپر بنی ہوئی پکی سڑک پر دوڑنے لگی۔ ابڑو صاحب چونکہ ریلوے کے انجینیر اور اس علاقے کے باشندے ہیں، مجھے بتانے لگے: جس پشتے پر ہماری یہ سڑک بنی ہوئی ہے اس کے اوپر کبھی سکھر کو رُک سے ملانے والی ریلوے لائن بچھی ہوتی تھی۔ یہ دیکھیے پٹڑی کے پتھر ابھی تک پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو گاؤں ہے، اس کا ریلوے اسٹیشن یہاں تھا، اور وہ جو احاطہ ہے، وہ دراصل چھوٹا ریلوے اسٹیشن تھا۔ یہاں لائن رُک کی طرف مُڑ جاتی تھی اور پھر یہی لائن دادو سے ہوتی ہوئی کوٹری اور کراچی چلی جاتی تھی۔ اس لائن سے الگ ہو کر ایک شاخ بی اور کوئٹہ جاتی تھی۔ اس وقت اس کا نام تھا: قندھار اسٹیٹ ریلوے یا کے ایس آر، اور دیکھیے سامنے وہ رہا رُک کا اسٹیشن جس کی پیشانی پر آج تک لکھا ہوا ہے: کے ایس آر۔ قندھار اسٹیٹ ریلوے۔

دور، دور تک دھان کے کھیت تھے۔ جوہڑ اور تالاب تھے، درخت تھے، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تھیں، چھوٹے بڑے گاؤں تھے اور زمین سے پھٹے پڑنے والے سبزے کے درمیان ایک بڑی عمارت کھڑی تھی۔ اونچے اونچے دروازے، بڑی بڑی محرابیں، ستون، برآمدے، دریچے، عمارت کے اوپر تاج نما پیشانی جس پر کبھی بڑا سا آہنی گھنٹہ آویزاں ہوگا، اس کے علاوہ ٹکٹ گھر، انتظار گاہ درجہ اول، انتظار گاہ درجہ دوئم، پینے کے پانی کا ذخیرہ، لیمپ روم، اسٹیشن ماسٹر کا دفتر، اُس میں کٹ کٹ کرتا ہوا پیغام رسانی کا آلہ، پانچ پانچ سو میٹر لمبی پلیٹ فارم، ان پر نیم دائرے کی شکل میں بنے ہوئے لوہے اور ٹین کے سائبان، پانی کے ذخیرے کا بہت اونچا ٹینک، ریلوے لائن پار کرنے کے لیے لوہے کا پُل (جو آج تک صحیح و سالم ہے کیونکہ اس کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی)، دونوں جانب سگنل کے بڑے کیبن، گاڑیوں میں تازہ پانی بھرنے کے لیے اونٹ کی گردن جیسی بڑی

بڑی ٹونٹیاں، کمروں کے اندر خوش نما فرش اور خدا جانے کیا کیا۔ یہ تھا رُک کا اسٹیشن۔

بڑے در کی پیشانی پر ابھی تک نہ صرف قندھار اسٹیٹ ریلوے اور انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے نام لکھے تھے بلکہ عمارت کی تعمیر کا سال ۱۸۹۸ء بھی درج تھا۔ میں اضطراب کے عالم میں ایک ایک دیوار دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی دیوار پر وہ تختی ضرور نصب ہوگی جس پر اس عمارت کی کچھ اور تفصیل درج ہوگی۔ اسٹیشن کے ملازموں نے کہا کہ انھوں نے کبھی کوئی تختی نہیں دیکھی مگر میں نے ٹکٹ گھر کے ہال میں ایک بیضوی تختی کا نشان ڈھونڈ لیا اور بے تاب ہوکر پوچھا:
'یہاں کیا تھا؟'

تب علاقے کے بوڑھے باشندوں نے بتایا کہ یہاں ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ ایک بار کوئی افسر آئے اور نکلوا کر لے گئے۔ اور وہ جو عمارت کی تاج نما پیشانی پر بڑا سا گھنٹہ لگا تھا؟ وہ بھی کچھ افسر لوگ اُتروا کر لے گئے۔ اور یہ جو پاکستان ریلوے کی صد سالہ یادگار کتاب میں محکمہ ڈاک کی ٹرالی کی تصویر چھپی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ٹرالی اب تک رک کے اسٹیشن پر کام آتی ہے، یہ کہاں ہے؟

ایک نوجوان نے کہا کہ ہاں یہ تو یہاں نظر آتی تھی۔ کہنے لگا کہ ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔ وہ میری کتاب ساتھ لے گیا اور اسٹیشن کے عملے کو دکھائی۔ ذرا دیر بعد وہ بھی منہ لٹکائے ہوئے آیا اور کہنے لگا کہ لاہور سے کچھ افسر لوگ آئے تھے، وہ ساتھ لے گئے۔ میں نے خوش ہوکر کہا کہ یہ تمام چیزیں یقیناً ریلوے کے قومی عجائب گھر میں جمع کرادی گئی ہوں گی اور بڑے عرصے کے لیے محفوظ ہوگئی ہوں گی۔ میں نے دل ہی دل میں ریلوے کے افسروں کا شکریہ بھی ادا کیا اور وہیں فیصلہ کیا کہ لاہور جاؤں گا تو ریلوے کے قومی عجائب گھر کی زیارت کا شرف بھی ضرور حاصل کروں گا۔ (اب سُنیے: میں وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ پاکستان ریلویز

کے کسی قومی عجائب گھر کا وجود ہی نہیں)۔ میں نے ریلوے ہیڈ کوارٹر کی راہداری میں ایک ملازم سے پوچھا کہ وہ جو قدیم اسٹیشن سے یادگار چیزیں نکالی گئی تھیں ان کا کیا بنا؟ اس نے صرف اتنا کہا' عابدی صاحب، آپ کس چکر میں پڑ گئے۔'

میرے رُک پہنچنے سے پہلے علاقے کے بزرگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ کوئی اچھے دنوں میں وہاں ملازم تھا اور کوئی سودا سلف بیچتا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اسٹیشن کی عمارت کے مقابل جو جھاڑیاں ہیں یہاں ریلوے کالونی تھی۔ اس میں انگریز افسر اور انجینئر رہا کرتے تھے۔ ان کی عمارتیں گر گئی ہیں مگر ان کا گورا قبرستان موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ وہیں ایک بڑا بازار بھی تھا۔ کوئٹہ جانے والے ہندوستان بھر کے مسافر یہاں خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ سامنے فوج کا ڈیری فارم ہے۔ کوئٹہ چھاؤنی کے لیے سارا دودھ مکھن یہاں سے جاتا تھا۔ اور بی سے پہلے جو ریگستانی علاقہ ہے اس کے باشندوں کے لیے پینے کا میٹھا پانی اب بھی یہیں رُک سے جاتا ہے۔ اس کے لیے ہر ہفتے ایک خصوصی ٹرین چلتی ہے۔ تو پھر کیا ہوا۔ اس اسٹیشن کو کس کی نظر کھا گئی؟ کتابوں میں تو ریلوے لائن چمن سے آگے نہ بڑھ سکی، قندھار تک پہنچنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اس کے علاوہ زلزلوں، بارشوں اور سیلاب نے اس لائن کو اپنی ٹھوکروں میں رکھا یہاں تک کہ بی سے اترنے والی لائن کو موڑ کر رُک سے ہٹا دیا گیا اور براہ راست سکھر سے ملا دیا گیا۔ بس اس کے بعد رُک کی رونق رخصت ہوگئی۔ مگر مقامی باشندے اس کی ایک اور کہانی سناتے ہیں۔ سینئر صحافی نثار کھوکھر نے راقم کو بتایا کہ' کہتے ہیں کہ رُک میں ایک جوگی رہا کرتا تھا جس کے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ با کمال بھی تھا اور اس کے گلے میں سُروں کا رس بھرا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ رات دو بجے کے قریب گانا شروع کرتا تھا تو اس کی آواز سن کر دور دور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ لوگ اس کا گانا سنتے جاتے تھے اور اس کی پھیلی ہوئی چادر میں پیسے ڈالتے جاتے

تھے۔ صبح کی روشنی ہوتے ہی جوگی وہ ساری رقم غریبوں کے حوالے کرتا اور چادر جھاڑ کر چلا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس صورت حال نے رقابت کی آگ بھڑکا دی اور جوگی کے مخالفوں نے ایک روز جب وہ رُک اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 3 پر کھڑا تھا، اس کو گولی ماردی۔ کئی گھنٹے اس کی لاش وہیں پڑی رہی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رُک کا اسٹیشن اپنی رونق سے محروم ہوگیا۔ اب اکثر گاڑیاں بغیر رُکے گزر جاتی ہیں۔ حالانکہ دیوار پر بڑا بڑا لکھا ہے: رُک۔

سندھ کے معروف ادیب علی احمد بروہی نے کنور رام کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ:

کنور رام نے زندگی کا آخری راگ، مانجھند میں گایا، مانجھند شہر میں گا کر ریل میں بیٹھ کر دادو میں اترے اور وہاں سے دوسری گاڑی میں سکھر جانے کے لیے رُک اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی کے چلنے کے بعد ان کو پیر صاحب بھر چونڈی کے مرید اور ظالم شخص جانو جلبانی اور اس کے ساتھی مراد سہریانی نے بندوق سے حملہ کر کے زخمی کر دیا، گاڑی میں علاج کی سہولت نہ ہونے کے سبب باگڑجی اسٹیشن تک خون زیادہ بہہ جانے کے سبب کنور رام دیہانت کر گئے۔ سکھر، روہڑی اور دیگر شہروں میں ہندو خواہ مسلمان اس افسوس ناک حادثے پر غم میں مبتلا ہو کر مشتعل ہوگئے۔ یہ واقعہ یکم نومبر 1939 کے دن وقوع پذیر ہوا۔ اُن کی آخری رسومات دو نومبر کو ادا کی گئیں۔ اُن کی آخری آرام گاہ ڈھرکی سنت ست رام داس کے چرنوں میں موجود ہے۔

❋

یہ ایمپریس مارکیٹ ہے یا رام دین پانڈے کی قبر؟

ایک روز ہمارے ایک دوست مولائی میر بحر نے فون کیا اور کہا کہ، آپ مختلف جامعات میں اردو پڑھاتے ہیں، میں ایمپریس مارکیٹ کے بارے میں مختلف ٹی وی چینلوں پر رپورٹیں دیکھ رہا تھا۔ بیشتر پر ہانپتے کانپتے رپورٹر جوشیلی آواز میں کہہ رہے تھے کہ ایمپریس مارکیٹ کے اطراف میں ناجائز تجاوزات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے تو کیا تجاوزات جائز بھی ہوتی ہیں؟

ہم نے جواباً ان سے کہا کہ، ایک معروف نیوز چینل پر کتا بچہ کو کُتا۔ بچہ بولا گیا ہمیں تو یہ بھی شک ہے کہ کسی دن چنانچہ کو چنا۔ نچہ نہ بولا جائے، یہ سن کر وہ ہنس دیے پھر کہنے لگے، کیا سپریم کورٹ رام دین پانڈے کے ساتھ انصاف کر پائے گی؟

رام دین پانڈے کون تھے کیا تھے اور انھیں سپریم کورٹ کیوں انصاف فراہم کرے؟ مزید یہ کہ اس کا ایمپریس مارکیٹ سے کیا تعلق بنتا ہے؟ اس پر آگے چل کر بات کرتے ہیں۔

ایمپریس مارکیٹ ایک تاریخی اہمیت کی حامل عمارت ہے اور اس کا 1857 کی جنگِ آزادی سے بھی تعلق بنتا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل، ایمپریس مارکیٹ اور اس سے متصل علاقوں میں 90 فیصد آبادی غیر مسلموں کی تھی، جن میں برطانوی راج کے اہل کار اور ان کے اہل خانہ اور ان کے علاوہ گوا اور مدراس سے یہاں آ کر بسنے والے انڈین مسیحی، پارسی اور بمبئی کے مراٹھی آباد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ایمپریس مارکیٹ کے اطراف میں پارسیوں کی عبادت گاہ دار مہر، کیتھولک عیسائیوں کے چرچ اور اسکول، پارسیوں کی جانب سے تعمیر کیے گئے پارک اور ڈسپنسریاں بھی نظر آئیں گی۔

مورخ محمد عثمان دموہی کے مطابق تقسیم سے قبل ایمپریس مارکیٹ میں مقامی لوگوں کا

داخلہ ممنوع ہوتا تھا۔ پیر علی محمد راشدی کے مطابق ایمپریس مارکیٹ سے متصل سڑکوں پر وکٹوریہ بگھیاں چلتی تھیں جن پر شام کو برطانوی راج کے اہلِ خانہ سیر سپاٹوں کے لیے سواری کرتے تھے۔ یہ پورا علاقہ نہایت صاف ستھرا ہوا کرتا تھا۔

1839 میں ایمپریس مارکیٹ کو کیمپ بازار کہا جاتا تھا۔ مارکیٹ کا نقشہ انجینیئر مسٹر جیمز اسٹریچن نے تیار کیا تھا۔ 10 نومبر 1884 کو اس عمارت کا سنگِ بنیاد گورنر بمبئی سر جیمز فرگوسن نے رکھا۔ یہ عمارت جودھپوری سرخ پتھر سے تعمیر کی گئی ہے، اس کے ٹاور کی اونچائی 140 فٹ ہے، مارکیٹ میں 4 گیلریاں ہیں، اس کا درمیانی حصہ 130 فٹ طویل اور 100 فٹ چوڑا ہے۔

مارکیٹ میں 280 اسٹالوں کی جگہ تعمیر کی گئی تھی، لیکن اب صورتحال بالکل مختلف ہے۔ ایمپریس مارکیٹ کے اطراف میں تجاوزات نے عمارت کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ وہ ٹاور جس پر ایک بڑا گھڑیال نصب تھا جس کی آواز سے علاقے میں بسنے والے لوگ جو گھڑیوں سے محروم تھے وقت کا تعین کرتے تھے۔ لیکن اب یہ گھڑیال دن میں صرف دو مرتبہ درست وقت بتاتا ہے، یہ وہ وقت ہے جہاں برسوں قبل اس کی گھڑی کے کانٹے ٹھہر گئے تھے۔

اس عمارت کی تعمیر کا ٹھیکہ 3 ٹھیکیداروں کو دیا گیا تھا، ان میں مسٹر ڈلوکیو، جے ایس ایڈ فلیڈ اور مسٹر ولی محمد جیون شامل تھے اور اس عمارت کی تعمیر پر ڈیڑھ لاکھ روپے سے زائد کی رقم خرچ ہوئی۔ کمشنر سندھ مسٹر پرچرڈ نے 21 مارچ 1889 کو عمارت کا افتتاح کیا اور چونکہ اس سال ملکہ وکٹوریہ کی سلور جوبلی بھی منائی جارہی تھی تو اس مناسبت سے عمارت کا نام ایمپریس مارکیٹ رکھا گیا۔

ہم ابتدا میں ذکر کر چکے ہیں کہ عمارت کی تعمیر کا تعلق 1857 کی جنگِ آزادی سے بھی بنتا ہے۔ اس کی حقیقت کچھ یوں ہے کہ 1857 میں کراچی میں مقیم برطانوی فوج کی 21 ویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے رام دین پانڈے کی قیادت میں ایک منصوبہ تشکیل دیا، جس کے مطابق ایک رات کو 21 ویں رجمنٹ کے سپاہیوں کو پورے کنٹونمنٹ پر قبضہ کرنا تھا اور انگریز فوجی

افسران کو قتل کر کے آزادی کا باقاعدہ اعلان کرنا تھا، لیکن 21 ویں رجمنٹ سے ہی تعلق رکھنے والے کچھ مخبروں نے اس کی اطلاع انگریز سرکار کو دے دی جس کے بعد انگریزوں نے راتوں رات رام دین پانڈے اور اس کے ساتھ منصوبے میں شامل 14 باغی سپاہیوں کو گرفتار کرلیا۔

13 اور 14 ستمبر 1857 کی درمیانی شب ان باغیوں کو جنگِ آزادی کی حمایت میں حصہ لینے پر ایمپریس مارکیٹ کے مقام پر خالی میدان میں سرِ عام پھانسی دی گئی جبکہ رام دین پانڈے سمیت دیگر 3 باغیوں کو توپوں کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعد ازاں ان لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کر کے ایک گڑھے میں پھینک دیے گئے، جن باغیوں کو پھانسی دی گئی تھی ان کی لاشوں کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور اسی گڑھے میں پھینک دیا گیا۔

معروف محقق گل حسن کلمتی کے مطابق ایمپریس مارکیٹ اسی جگہ پر تعمیر کی گئی تھی۔ ایمپریس مارکیٹ کی تعمیر کا مقصد لوگوں کو خرید و فروخت کی سہولتیں فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی، ہوا یہ کہ اس واقعے کے بعد مقامی لوگ رات کی تاریکی میں یہاں آتے تھے اور اس مقام پر گلدستے رکھ کر چلے جاتے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر انگریز سرکار کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ آہستہ آہستہ شہدا کی یادگار نہ بن جائے، اور کسی نئی بغاوت کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو، اس لیے یہاں ایمپریس مارکیٹ تعمیر کردی گئی اور انگریز اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہا۔

اب معدودے چند لوگوں کے شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ یہ رام دین پانڈے اور دیگر شہدا کی یادگار ہے۔ چند برس قبل سول سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد نے یہاں پر شام کو شمعیں روشن کر کے ان کی یاد منائی تھی اور یہ عہد کیا تھا کہ ہر سال یہ یاد منائی جائے گی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکا۔

ایمپریس مارکیٹ کے اطراف میں تمام تجاوزات ختم کردی گئی ہیں۔ اطلاعات ہیں کہ تجاوزات کے مقام پر پارک بنایا جائے گا۔ سندھ حکومت اس سے قبل مراد علی شاہ کی رہنمائی میں جہانگیر پارک جیسے ویران اجاڑ مقام کو ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کرچکی ہے۔ اب یہ پارک کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن بنائے یا سندھ حکومت، لیکن کیا اس پارک کا نام رام دین پانڈے پارک رکھا جاسکتا ہے؟ یا پھر اس کے لیے بھی کوئی سرپھرا شہری چیف جسٹس ثاقب نثار کی عدالت

میں مفاد عامہ کی نسبت سے درخواست دائر کر کے یہ گزارش کرے گا کہ مجوزہ پارک کا نام رام دین پانڈے پارک رکھا جائے۔

آخر میں ایک اور بات یہ کہ تجاوزات کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن اگر آپ لکی اسٹار کے کونے پر میر کرم علی تالپور روڈ سے کھڑے ہو کر ایمپریس مارکیٹ کو دیکھتے تھے تو اس کی عمارت بہت واضح نظر آتی تھی لیکن نہ جانے کس کے مشورے پر ایمپریس مارکیٹ کے بالکل سامنے میر کرم علی تالپور روڈ پر عجیب بدوضع سے شیڈ بنا دیے گئے ہیں جس وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ یہ ایمپریس مارکیٹ کی پیشانی پر بدنما داغ ہے، یہ شیڈ کسی حکومتی ادارے کی جانب سے بنائے گئے ہیں، ہم نے بڑی کوشش کی کہ شیڈ کے اطراف میں کوئی ایسی تختی تلاش کر پائیں جس پر شیڈ تعمیر کرنے والے ادارے کا کوئی نام ہو لیکن ہم ناکام رہے تو کیا ان سرکاری تجاوزات کو بھی ہٹایا جائے گا؟

ایمپریس مارکیٹ پر تجاوزات کے خاتمے کا اثر اتنا ہوا کے آس پاس کی شاہراہوں پر بھی تجاوزات کے خاتمے کا آغاز ہو گیا، کچھ تو بلدیاتی عملے نے اپنا کام دکھایا اور کہیں لوگوں نے ہی خود کام شروع کر دیا اور ایسے ایسے انکشافات ہوئے کہ عقل حیران رہ گئی۔

ایک اور عمارت پر فریڈرک کیفے ٹیریا کا خوبصورت سائن بورڈ بھی نظر آیا جس کے بارے میں نامور روشن خیال ماہر تعلیم ڈاکٹر ریاض شیخ کا کہنا ہے کہ اس کیفے ٹیریا میں تقسیم سے قبل مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات بیٹھ کر سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ سن تعمیر ایک خوبصورت لوہے کی گرل میں کندہ کیا گیا ہے۔

ریگل چوک پر ریگل ٹریڈ اسکوائر کے ساتھ جو دکان مسمار کی گئی اس کے پیچھے ایک نالہ برآمد ہوا اور اس پر ایک سرکاری ٹوائلٹ بھی نظر آیا۔ ٹوائلٹ کے ساتھ ایک نجی بینک کی عمارت بھی موجود ہے جو نالے پر ہی بنی ہوئی ہے۔ یہ کب بنی کیوں بنی اور کیسے بنی اس کا علم نہیں۔

یہ سب دیکھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ 'ناجائز تجاوزات' میں نہ جانے ایسی کتنی ہی تاریخی عمارتیں دفن ہوں گی جنھیں نکالنے کے لیے مزید کتنے آپریشن کرنے پڑیں گے۔

❁

''جام ساقی، آپ کسی دن مروائیں گے''

جام ساقی ... محمد جام نے جب یہ نام اختیار کیا تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ اردو میں جب اسے پکارا جائے گا تو وہ میکدے کے ساتھ جُڑ جائے گا، لیکن اس جام اور ساقی کی زندگی کا زیادہ وقت میکدے کے بجائے زندان میں گزرا۔ اُن کا علاقہ اس قدر پُر امن تھا کہ اُن کی پہلی جیل یاترا کے وقت تھر میں 'جھنجین جوتڑ' نامی اُن کے گاؤں کے لوگوں کو یہی پتا تھا کہ جیل صرف ایسے لوگ جاتے ہیں جنھوں نے قتل یا چوری جیسا کوئی سنگین جرم کیا ہو۔ کوئی سیاسی نظریات کی وجہ سے بھی پکڑا جا سکتا ہے یہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ لوگ اکثر جام ساقی کی شریکِ حیات سکھاں کو بتاتے تھے کہ اُن کے شوہر پر بہت زیادہ تشدد کیا جا رہا ہے۔ جب یہ اطلاعات تسلسل کے ساتھ آنے لگیں تو مایوس ہو کر سکھاں نے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی۔ تھر کے کنویں ایک ہزار فٹ گہرے ہوتے ہیں۔ گہرائی، اندھیرا اور کنویں میں گرے ہوئے سانپ، تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کی زندگی بھی ایسے ہی گزرتی ہے۔ ایسے عالم میں صدیوں کے پیاسے تھر کو جام بھی مل رہا تھا اور ساقی بھی۔

جام ساقی کی شہرت کب شروع ہوئی اور کب وہ مظلوموں کے ساتھی اور ہمدرد بن کر منظرِ عام پر آئے؟ اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں، لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے وقت جام ساقی مزاحمت کی آواز بن کر اُبھرے اور پاکستان کے سیاسی و سماجی منظرنامے پر ایک مضبوط و توانا آواز بن کر چھا گئے۔ جام ساقی نے 7 مرتبہ جیل یاترا کی، پہلی مرتبہ 4 مارچ 1967ء کو گرفتار ہوئے، وہ ضیاء حکومت میں سب سے طویل عرصہ، 8 برس پسِ زنداں رہے۔

'1983ء میں جب جام ساقی اور اُن کے ساتھیوں پر کراچی کی ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور اخبارات میں خبریں آنا شروع ہوئیں تو اُس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں بھی شروع ہوگئیں۔ کچھ لوگ اُنھیں راہِ حق پر سمجھتے تھے اور کچھ نہیں، لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ اُن سے کوئی جرم سرزد ہوا تو وہ سیاسی نوعیت کا ہے۔'

1983ء میں جب جام ساقی گرفتار ہوئے تو اُنھیں 13 ماہ کی نظر بندی کے بعد عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت میں اپنے بیان ریکارڈ کرواتے ہوئے جام ساقی نے اس وقت کے صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق اور اراکینِ عدالت کو کس انداز میں مخاطب کیا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ جام ساقی نے کہا:

'مجھ پر یحییٰ خان کے غیر قانونی اقتدار کے دوران خصوصی فوجی عدالتوں میں مقدمے چلائے گئے۔ 1969ء کے اوائل میں مجھے اس بنیاد پر گرفتار کیا گیا تھا کہ میں نے ون یونٹ کے خلاف بیجز تقسیم کیے تھے۔ مجھ پر مئی 1969ء میں ایک میجر جاوید مجید کی خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ سی آئی ڈی کے ایک گواہ نے عدالت کو بتایا کہ انھیں ایک وائرلیس پیغام موصول ہوا ہے کہ میں سرحد پار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے اس پر شدید دکھ ہوا ہے اور میں اپنے جواب میں جذباتی ہوگیا۔ پریزائڈنگ افسر میرے جذبات کو محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں نے اسے آبدیدہ دیکھا تھا۔ مگر اس نے مجھے ایک سال کی قید سزا سنادی تھی۔'

مجھے ایک اور انوکھا واقعہ یاد ہے۔

'مجھ پر مارشل لاء ریگولیشن 5، 16 اور 19 کی خلاف ورزی پر مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے ون یونٹ کی مخالفت کر کے ایم ایل آر 19 کی خلاف ورزی کی تھی۔ میں نے صدرِ عدالت سے پوچھا کہ یہ ایم ایل آر 5 اور 16 کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ نہیں جانتا، میں نے اس پر کہا کہ میں اس وقت تک عدالت کو مقدمہ جاری رکھنے کی اجازت نہیں دوں گا جب تک عدالت یہ نہیں جان لیتی کہ وہ قواعد کیا ہیں جن کی خلاف ورزی کا الزام مجھ پر عائد کیا گیا ہے۔ میجر جاوید نے 10 منٹ کے وقفے کا اعلان کیا اور جب کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو اس

نے بتایا کہ ایم ایل آر 5 غداری کے بارے میں ہے اور اس نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ جہاں تک ایم ایل آر 16 کا تعلق ہے، حیدرآباد 'بگ بی' کو بھی اس کے متعلق علم نہیں ہے۔ تاہم بغیر کسی تاخیر کے اس نے وہ سزا سنادی جس کے لیے اسے بھیجا گیا تھا۔'

جب مجھے لاہور کے بدنامِ زمانہ عقوبت خانے شاہی قلعے میں قید کیا گیا تو میں نے کچھ پیسے اپنی شلوار کے نیفے میں چھپائے ہوئے تھے۔ میری کھولی پر متعین گارڈ سے میں نے درخواست کی کہ میں اسے پیسے دے سکتا ہوں اگر وہ مجھے سگریٹ کا پیکٹ لادے۔ پہرے دار نے کہا کہ:

'آج تو ممکن نہیں، کل لاکر دے دوں گا۔'

دوسرے دن وہ پیکٹ لے آیا میں نے اسے پیسے دیے۔ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ:

'کس چیز کے پیسے۔ اب جب تک آپ یہاں قید ہیں میں آپ کو سگریٹ لاکر دوں گا۔'

پھر وہ بھرّائی ہوئی آواز اور بھیگی پلکوں کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا کہ:

'یہ سب کچھ آپ اپنے لیے تو نہیں ہماری قوم کے لیے کر رہے ہیں۔'

سابق صدر یحییٰ خان کے دور میں بھی جام ساقی مسلسل جبر کا شکار رہے۔ حتیٰ کہ ایک بار ان کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم صادر کردیا گیا تھا۔

احمد سلیم اور نزہت عباس اپنی تحقیقاتی کتاب 'جام ساقی، چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی' میں جام ساقی کی زندگی میں پیش آنے والے مختلف واقعات پر کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

'گولی مارنے کا حکم سن کر جام ساقی روپوش ہوگئے۔ انھوں نے ایک مولوی کا روپ دھار لیا۔ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھ نہ لگے تو ملٹری سمری کورٹ میں اُن کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں ایک سال قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ مسلسل روپوشی کا دور خاصا طویل تھا۔ اسی حالت میں وہ ایک مہم جو کی طرح روپوشی کی زندگی گزارتے رہے۔ اسی روپوشی کے دوران اُن کے بارے میں افواہیں پھیلائی گئیں کہ وہ ہندوستان فرار ہوگئے ہیں کیونکہ ہندوستان سے اُن کے بیانات نشر ہوئے تھے۔'

مسلسل روپوشی میں 1972ء آ گیا۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی نیپ کی حکومتیں بن چکی تھیں۔ بلوچستان میں جام کے دوست میر غوث بخش بزنجو گورنر بن چکے تھے۔ اب جام نے روپوشی ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آریسر والی مسجد میں گئے اور داڑھی وغیرہ صاف کی۔ اُس وقت ہوٹل شمریز میں کامریڈ غلام محمد لغاری اور سید باقر علی شاہ نیپ کی طرف سے پریس کانفرنس کر رہے تھے۔ یہ وہاں پہنچ گئے لیکن طلباء اور سیاسی رہنماؤں کی موجودگی میں پولیس انھیں گرفتار کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ وہاں سے وہ یونیورسٹی کی بس میں بیٹھ کر ہاسٹل گئے اور رات کو جلسے سے خطاب کیا۔ دوسرے دن نواب شاہ چلے گئے جہاں نیپ اور ہاری کمیٹی کا مشترکہ جلسہ ہونا تھا۔ ان کی شرکت نیپ اور مزدور محاذ کی طرف سے تھی۔ انھوں نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ پولیس، جو اس بار پوری تیاری کر کے آئی تھی، نے اُنھیں دھر لیا۔ یحییٰ خان کی حکومت نے اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے تھے لیکن پیپلز پارٹی کی سویلین مارشل لاء حکومت کی پولیس انھیں گرفتار کیے بغیر نہ رہ سکی۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ روپوشی کے اس طویل دور میں جام ساقی نے داڑھی بڑھالی تھی اور تبلیغی جماعت والوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا تھا۔ اگر چہ انھیں 1978ء سے پہلے گرفتار نہ کیا جا سکا لیکن کئی مرتبہ اُن کے کمیونسٹ دل اور انسان دوستی کے جذبات انھیں گرفتاری کی طرف لے گئے تھے۔ اس عرصے میں راقم الحروف سے بھی ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اسی حلیے میں تھے لیکن انھوں نے ٹوٹے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے، میں نے مُسکرا کر کہا تھا:

'کامریڈ! احتیاط کریں۔ تبلیغی جماعت والے ٹوٹے ہوئے چپل نہیں پہنتے۔'

ہم نے خود جام ساقی کی زبانی ایسے کئی واقعات سنے جنھیں دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ کچھ یوں تھا کہ:

'ایک دفعہ بس میں، میں نذیر عباسی کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے کولی کو تکلیف کی حالت میں کھڑا دیکھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔ وہ میری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب ہم ٹنڈو الہیار پہنچے تو نذیر عباسی بولا کہ کامریڈ! آپ کسی دن مروائیں گے، کوئی بھی اصلی

مولوی بوڑھے اور بیمار کو بھی کو اپنی جگہ نہیں دیتا۔ اگر بس میں کوئی سی آئی ڈی کا آدمی ہوتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ آپ اصلی مولوی نہیں ہیں۔'

ایک اور واقعہ کچھ یوں ہے کہ:

'ایک بار جامع مسجد کے پاس سے گزر رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔ مولوی صاحب جنازہ پڑھا دیں۔ انھیں جنازہ پڑھانا تو آتا نہیں تھا (اس واقعے کے بعد سیکھ لیا تھا)۔ جام ساقی نے اُن سے معذرت کی اور کہا وہ بہت جلدی میں ہیں۔ اُنھیں ایک ضروری کام کے لیے کہیں پہنچنا ہے، اس لیے جنازہ پڑھانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر جام چل پڑے تو پیچھے سے آواز آئی، 'یہ سالا کسی دعوت پر جا رہا ہوگا۔' جام کو خوشی ہوئی کہ وہ پہچانے نہیں گئے اور یہ گالی مولوی کو پڑی ہے، اُنھیں نہیں۔'

پروفیسر جمال نقوی کتاب ضمیر کے قیدی میں لکھتے ہیں کہ:

'یکم ستمبر 1983ء کو میری کورٹ میں پیشی تھی اس دن میں علی الصباح بے ہوش ہو گیا۔ دوستوں نے مجھے اُسی حالت میں پولیس وین میں ڈالا اور کورٹ لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر کو بلایا گیا اور معائنے سے پتا چلا کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اس کے بعد مجھے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ہمارے ساتھی جام ساقی نے میرے اسپتال جانے پر کورٹ سے شدید احتجاج کیا اور کہا کہ مجھے اسپتال نہ بھیجا جائے بلکہ کورٹ میرا علاج کرے۔ کرنل صاحب اس بات پر بہت برہم ہوئے کہ کورٹ مریض کا علاج کیسے کر سکتا ہے اور کہا کہ وہ کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہیں۔ اس پر جام ساقی نے کہا کہ جناب آپ تو جج بھی نہیں ہیں جب آپ قانون کو جانے بغیر مقدمہ چلا سکتے ہیں تو میڈیکل سائنس کو جانے بغیر علاج بھی کر سکتے ہیں۔'

جام ساقی کے انتقال سے سیاست وسماج سے رواداری، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کا ایک درخشاں باب بند ہو گیا۔ جام ساقی منوں مٹی کی چادر اوڑھ کر تہہ خاک ہو گئے لیکن وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو اپنے نام اور کام کی نسبت سے منفرد تھے۔ جام ساقی، پاکستان میں عوامی جدوجہد کرنے والوں میں سرِفہرست ہیں۔ غیر طبقاتی سماج کے لیے جہدِ مسلسل کرنے والے جام

ساقی نے کبھی مفاہمت نہیں کی اور نہ کبھی اپنے نظریے اور اصولوں کو قربان کیا۔

وہ پاکستان کی عوامی تاریخ کا ایک ایسا کردار ہیں جو آج نہیں تو کل اس دھرتی پر انقلاب کا تسلسل ثابت ہوں گے۔

❊

راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے شوق

ہندوستان کے راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے بڑے ہی عجیب وغریب شوق اور مشاغل تھے۔ اُن میں سے کچھ تو قابلِ بیان ہیں اور بہت سے ناقابلِ بیان۔ ان والیانِ ریاست کا انجام بہت دردناک ہوا۔ اُن کی وہ شان وشوکت اور مشاغل اب صرف تاریخ کا ایک حصہ ہیں لیکن اُن کے معمولات اتنے سطحی تھے کہ لوگ اب صرف ان کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن پاکستان کے تعلق سے سب سے دردناک انجام نواب آف جوناگڑھ اور ان کے خاندان کا ہوا۔

جوناگڑھ کا شمار متحدہ ہندوستان کی اُن ریاستوں میں ہوتا ہے جس کے نواب نے تقسیمِ ہند کے وقت پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا۔ جوناگڑھ کے نواب مہابت خانجی مسلمان تھے جب کہ ریاست کی 80 فیصد آبادی غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ مہابت خان نے باقاعدہ طور پر 31 مارچ 1920 کو ریاست کی باگ ڈور سنبھالی۔ نواب مہابت خان کو ریاستی امور میں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنا بیشتر وقت کتوں کے ساتھ گزارنا پسند فرماتے تھے۔ ریاست کا تمام انتظام اور حکومتی امور وزیرِ اعظم کے حوالے ہوتے تھے، جسے دیوان کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ریاست کے آخری وزیرِ اعظم محترمہ بینظیر بھٹو کے دادا سر شاہنواز بھٹو تھے۔

مصنف اقبال پاریکھ اپنی کتاب جوناگڑھ اجڑے دیار کی کہانی میں لکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے نواب صاحب کو بہت سے خطابات سے نواز رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ریاست کے پولیٹکل ایجنٹ نے اُنھیں ایک اور خطاب کی پیشکش کر دی اور یہ سنتے ہی وہ تلملا کر بولے، 'نہیں نہیں مجھے اور کوئی خطاب نہیں چاہیے، خواہ مخواہ مجھے وائسرائے کا شکریہ ادا کرنے دہلی جانا پڑے گا'۔

وہ مزید لکھتے ہیں کبھی کبھی نواب صاحب باغ میں بھی نظر آجایا کرتے تھے۔ وہ کھلی کار میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوتے اور پچھلی سیٹ کتوں کے حوالے ہوتی۔ کار دھیمی رفتار سے چلتی رہتی اور کتے زبان نکالے ہواخوری کے مزے لیتے رہتے۔ نواب صاحب ہر کتے کو اس کے الگ نام سے پکارتے تو وہ اچک کر باہر نکل جاتا اور کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا۔ پاریکھ صاحب کا قلم نواب صاحب کے کتوں کا ذکر بڑے دھیمے لہجے میں کرتا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ نواب مہابت خان کا کتوں کا شوق اپنی جگہ مگر انھیں عام لوگوں سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ وہ ان کی فلاح و بہبود کا ہر ممکن خیال رکھتے تھے، خاص طور پر مسلمانوں کا درد ان کے دل میں بہت تھا۔

نوابوں، راجاؤں اور مہاراجاؤں کا ذکر صحافی لیری کولنس، ڈامنک لیپئر کی کتاب 'آزادی نیم شب' (فریڈم ایٹ مڈنائٹ) میں بھی ہوا ہے، جس کا ترجمہ سعید سہروردی نے کیا ہے۔ ان دونوں صحافیوں نے اپنی کتاب کے ایک باب 'محل اور شیر، ہاتھی اور جواہرات' میں تقسیم کے وقت راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے حالات بڑے دلچسپ اور بے باک پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جوناگڑھ کے نواب کا کتے پالنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس کے محبوب کتوں کے کمروں میں بجلی اور پانی کا بندوبست تو تھا ہی، مگر اس کے ساتھ ساتھ ٹیلیفون کی سہولت بھی موجود تھی۔ یہی نہیں، بلکہ کتوں کی خدمت کے لیے ملازم ہر وقت تعینات رہتے تھے۔ حال یہ تھا کہ جوناگڑھ کے محض 10 سے 20 افراد کے علاوہ کسی اور کا معیارِ زندگی ان کتوں سے زیادہ بلند نہیں تھا۔

جوناگڑھ کے نواب نے اپنی چہیتی کُتیا 'روشن' کی شادی ایک Labrador کتے 'بوبی' کے ساتھ کی، جس میں شرکت کے لیے اُنھوں نے ہندوستان کی ہر مشہور و معروف شخصیت، راجاؤں، مہاراجاؤں، یہاں تک کے وائسرائے کو بھی مدعو کیا۔ وائسرائے تو خیر نہیں آئے لیکن مدعو حضرات میں سے بیشتر تشریف لے آئے اور ڈیڑھ لاکھ مہمان جمع ہو گئے۔ بارات بڑے ہی شان دار انداز سے نکلی جس میں نواب کے ہاتھی اور باڈی گارڈز نے بھی شرکت کی۔ سب کی ضیافت لذیذ اور مرغن کھانوں سے کی گئی۔ اس تقریب پر نواب صاحب نے 60 ہزار پاؤنڈ خرچ کیے۔ اس خطیر رقم

کو اگر اُس زمانے کی قیمتوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یوں سمجھ لیجیے کہ اس رقم سے 12 ہزار افراد کی پورے سال پرورش ہو سکتی تھی۔

اسی طرح مہاراجہ گوالیار نے لوہے کی ایک بہت بڑی میز بنوائی۔ اُس پر چاندی کی پٹڑیاں بٹھائی گئیں جن کی لمبائی 250 فٹ سے زیادہ تھی۔ یہ میز کھانے کے کمرے میں رکھ دی گئی۔ دیوار میں سوراخ کر کے پٹڑیاں اس طرح آگے بڑھائی گئیں کہ اُس میز کا ربط مہاراجہ کے باورچی خانے سے قائم ہو گیا۔ اُس کے بعد ایک کنٹرول پینل بنایا گیا، جس میں نا جانے کتنے سوئچ، الارم، سگنل اور لیور لگے تھے۔ یہ پینل میز پر فٹ کر دیا گیا۔ مہاراجہ کے مہمان میز کے چاروں طرف بیٹھتے اور مہاراجہ خود کنٹرول پینل کو قابو کرتے تھے۔ وہ سوئچ دباتے، لیور اُٹھاتے گراتے، نہ جانے کیا کھڑ پڑ کرتے۔

چاندی کی پٹڑیوں پر ٹرین دوڑتی، رکتی، سرکتی اور بھاگتی رہتی تھی۔ وہ ٹرین باورچی خانے میں جاتی تھی جہاں ملازم چپاتی، ترکاری اور دوسرے کھانے ٹرین کے کھلے ڈبوں میں رکھ دیتے تھے۔ مال سے لدی ہوئی ٹرین کھانے کے کمرے میں آتی تھی۔ مہاراجہ کو یہ اختیار تھا کہ وہ جس مہمان کے سامنے چاہتے ٹرین کو روک دیتے اور وہ اپنی پسند کی چیزیں نکال لیتا۔ اسی طرح وہ جسے بھوکا رکھنا چاہتے تو کنٹرول کے مخصوص بٹن دبا دیتے، مال سے لدی ہوئی ٹرین بچارے مہمان کے سامنے سے بغیر رُکے سرسراتی ہوئی آگے نکل جاتی تھی۔

ایک رات مہاراجہ نے وائسرائے اور اُس کے اہلِ خانہ کو کھانے پر مدعو کیا تو کنٹرول پینل میں شارٹ سرکٹ ہو گیا۔ مال سے لدی ہوئی گاڑی باورچی خانے سے تیر کی طرح آئی اور طوفانی رفتار سے میز کا چکر کاٹنے لگی اور رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کھلے ڈبوں سے سبزی، دال، گھی، تیل اچار اُچھل، اُچھل کر مہمانوں کے کپڑوں پر گرنے لگا، مہمان توبہ توبہ کر اُٹھے۔ ریل کی تاریخ میں اس قسم کا حادثہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ عیش اور نفس پرستی کے علاوہ مذہب سے گہری وابستگی بھی راجاؤں کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ بنارس کے مہاراجہ کا معمول یہ تھا کہ صبح کے وقت اُس کی پہلی

نظر گؤ ماتا پر پڑنی چاہیے۔ ہر صبح اُن کی خواب گاہ کی کھڑکی پر ایک گائے کھڑی کر دی جاتی۔ نوکر اُسے کونچتے، وہ رمباتی۔ اس سے مہاراجہ کی آنکھ کُھل جاتی اور پہلی نظر گائے پر پڑتی۔ ایک بار مہاراجہ بنارس اپنے دوست نواب رام پور کے مہمان ہوئے۔ وہاں اُنھیں دوسری منزل پر ٹھہرایا گیا۔ اب اتنی اونچائی پر ان کی خواب گاہ کی کھڑکی پر گائے کیسے پہنچائی جائے؟ آخر خاص طور پر صرف اِسی مقصد کے لیے نواب رام پور نے بلا تاخیر کرین خرید لی۔

جب کرین سے گائے کو اوپر اُٹھایا جاتا تو ہوائی سفر کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے گائے رمبانا شروع کر دیتی اور کسی نوکر کو کونچنے کی ضرورت نہ پڑتی اور مہاراجہ بنارس کی آنکھ کھل جاتی اور پہلی نظر گائے پر پڑنے کا معمول پورا ہو جاتا۔

نواب آف جونا گڑھ کے خاندان کا دردناک انجام کیوں ہوا اور اس کی وجوہات کیا تھیں اِس کا تفصیلی ذکر بھوپال کی شہزادی، عابدہ سُلطان نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ وہ اِس ضمن میں لکھتی ہیں کہ:

''1950ء میں جب میں پاکستان آئی تھی تو میں نے دیکھا کہ شاہی جونا گڑھ ہاؤس، عجیب بے ڈھنگا اور عیش کوش طرزِ زندگی کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ ان کا رویّہ حکومتِ پاکستان اور ہم جیسوں، جو شاہی ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے، کے لیے باعث شرمندگی تھا۔ نواب جونا گڑھ کا مستقل مشغلہ اپنے کتوں کی فوج میں مشغول رہنا تھا، جو وہ جونا گڑھ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُن میں سے زیادہ تر بازاری کتے تھے۔ یہ کُتے ہر صبح ہز ہائی نس کے سامنے باقاعدہ پریڈ کرتے اور اکثر اُن پالتو جانوروں کی شادی کی تقریبات منعقد کی جاتیں، جس میں ان کو دُلہا دُلہن کے مخصوص لباس پہنائے جاتے، موسیقی کی محفل جمتی اور حاضرین دربار خراج تحسین پیش کرتے۔ نواب صاحب کے ساتھ اُن کے خوشامدیوں اور طرح طرح کے مسخروں کی ٹولی رہتی اور اپنے محبوب بازاری کتوں اور تین جونا گڑھی بیویوں کے درمیان گھرے رہتے۔ ان کا اُن کی بڑی بیگم یعنی ''ماں صاب'' سے ہمیشہ اختلاف رہا جنھیں الگ گھر میں علاحدہ کر دیا گیا تھا۔ دلاور منزل کا نام ان کے بیٹے دلاور خانجی کے نام پر رکھا گیا تھا جو خوب صورت جوان، پبلک اسکول کا تعلیم یافتہ اور

ان کا اکیلا وارث تھا۔"

دلاور منزل میں ماں صاب اپنے اور بھی زیادہ عیش کوش خاندان پر حکومت کرتی تھیں جواُن کے بھوپالی رشتہ داروں، طفیلیوں اور ذاتی ملازمین پر مشتمل تھا۔ ماں صاب نے اپنے خاوند کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کر رکھا تھا۔ دونوں گھر سازشوں کا گڑھ بن گئے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی، بے وفائی اور دوغلے پن کے الزامات ان کا روز کا معمول بن چکا تھا۔ نواب صاحب کی طرف سے ناکافی ماہانہ مشاہرے کی وجہ سے ماں صاب اپنے شاہانہ طرزِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے زیورات بیچنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ ماں صاب اپنی کشادہ دلی کی عادت کی وجہ سے اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتیں۔ گھر کے 30 افراد کے علاوہ اتنے ہی ملنے جلنے والے ہر روز رات کا کھانا کھاتے۔ اُن کے گھر کے اخراجات تو کافی زیادہ تھے ہی لیکن مالی وسائل میں کمی کی ایک بڑی وجہ ان کا اپنے لیے دوڑ کے گھوڑے خریدنا اور ریس کے میدان میں سٹے بازی کا شوق تھا۔

ماں صاب ہر صورت باقاعدگی سے کراچی ریس کلب جاتی تھیں۔ اُن کے ساتھ شیروانیوں میں ملبوس رشتے داروں کا مجمع ہوتا اور وہ بیش قیمت ساڑھی اور کالے چشمے پہنے وی آئی پی انکلوژر میں بیٹھتیں۔ وہاں وہ بے ایمان جواریوں اور دھوکے باز گھڑسواروں کے کہنے پر بڑا بڑا سٹہ کھیلتیں۔ بڑی بڑی رقم ہارنے کے باوجود کبھی کبھی معمولی کامیابی سے بہت خوش ہوتیں اور کراچی کے رہنیوں کے ہاں اپنے مزید قیمتی زیورات رہن رکھتیں، جنھوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ بیگم صاحب جب بھی ریسوں میں پیسہ ہارتی ہیں تو ان کی موج ہو جاتی ہے۔

دلاور منزل میں ماں صاب اپنے ملنے والوں کے ساتھ جتنی کشادہ دلی سے پیش آتی تھیں، اپنے ذاتی ملازمین کے ساتھ برتاؤ میں وہ اتنی ہی بے رحمی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ ماں صاحب کے گھر کی دیکھ بھال اللہ رکھی نامی ایک سخت خوف ناک، چھ فٹ لمبی، حبشن کے ذمے تھی۔ ملازمین کی چھوٹی موٹی کوتاہیوں پر ماں صاب کو آنے والا غصہ اس لمبی عورت کے ذریعے اتارا جاتا جواُن غریب ملازم عورتوں کو اذیت دیتی رہتی۔

میں نے اکثر ماں صاب کو سمجھایا کہ وہ ملازمین پر ظلم کرنا چھوڑ دیں اور اُنھیں خبردار کیا کہ وہ

اب شاہی ریاست میں نہیں رہتیں جہاں وہ قانون کی پہنچ سے بالاتر تھیں۔ پاکستان میں رہ کر حد سے تجاوز کرنا اُنھیں کسی مصیبت میں پھنسا سکتا ہے۔ ماں صاحب میرے انتباہ کو یہ کہہ کر نظرانداز کر دیتی تھیں کہ لڑکیاں مبالغہ کر رہی ہیں اور ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوئے جا رہی ہیں، اور اللہ رکھی توان کو قابو میں رکھنے کے لیے محض ہلکی پھلکی سزائیں دیتی ہے۔

29 جنوری 1952ء کو میں دلاور منزل آئی تو دیکھا کہ پولیس کے ایک دستے نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ گھر میں بھی افسردہ خاطر اور دم بخود تھے۔ مجھے بیا جی نے خاموشی سے بتایا کہ ملازمین میں سے ایک عورت بانو فوت ہوگئی ہے۔ پوسٹ مارٹم سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اُس کی موت بُری طرح مار پیٹ سے واقع ہوئی ہے۔ پولیس ماں صاب، اُن کے ملازمین اور گھر کے تمام افراد سے تفتیش کر رہی ہے۔

جب بیا جی مجھے اس وحشت ناک واقعے کے متعلق بتا رہی تھیں تو ایک پولیس انسپکٹر نیچے آیا اور مجھے پہچاننے کے بعد مجھے گھر واپس چلے جانے کے لیے کہا کیونکہ تفتیش میں کافی وقت درکار تھا۔ اُس نے تصدیق کی کہ بانو کی موت مار اور خوف ناک قسم کی زیادتی کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے۔ میں نے انسپکٹر سے ماں صاب سے چند منٹ ملاقات کی درخواست کی جسے اُس نے کچھ تامل کے بعد منظور کر لیا۔ جب ماں صاب کے کمرے میں گئی تو اُنھیں بڑی جذباتی اور گستاخانہ کیفیت میں پایا۔ وہ بڑی بے باکی سے دعویٰ کر رہی تھیں کہ قانون بیگم جوناگڑھ کو چھو بھی نہیں سکتا۔ مگر اسی دوران انھوں نے اللہ رکھی کو یہ کہہ کر موردِ الزام ٹھہرایا کہ اس نے بانو کو اُس کے جرم سے زیادہ سزا دی تھی۔ میں نے ماں صاب کو تسلی رکھنے اور اپنے قانونی حقوق کے سلسلے میں سیکریٹری خارجہ جناب اکرام اللہ اور اپنے خاوند نواب صاحب سے بھی مشورہ کرنے کے لیے کہا، اگرچہ اُن کے اپنے شوہر سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اِس کے بعد میں بانو کے قتل کے نتائج کے خوف میں مبتلا، واپس گھر آ گئی۔

اگلے دن اخبارات نے بانو کے قتل کی سرخیاں جمائیں۔ ماں صاب قتل کے جرم میں بغیر ضمانت گرفتار کر لی گئیں اور اُنھیں کراچی جیل لے جایا گیا۔ اللہ رکھی نے ماں صاب کے خلاف گواہی دے دی کہ دوپہر کے وقت ماں صاب کو پتا چلا کہ بانو نے اُن کے باتھ روم میں پیشاب کیا

ہے۔ ماں صاب کو سخت غصہ آیا، لیکن اُنھیں ریس میں جانا تھا اور دیر ہو رہی تھی، لہٰذا اُنھوں نے بانو کو چند تھپڑ مارے اور اللہ رکھی کو حکم دے گئیں کہ وہ اُسے مارے اور اُس کے جسم کے مخصوص حصوں میں مرچیں بھر دے تاکہ باقی سب ملازمین بھی سبق سیکھ لیں۔

خوف ناک اللہ رکھی نے ماں صاب کی خواہش سے بڑھ کر اُن کے حکم کی تعمیل کی اور جب ماں صاب ریس سے واپس لوٹیں تو بند کمرے سے بانو کی کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں جہاں اُسے قید رکھا گیا تھا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ اُس غریب کی کوئی مدد کرتا۔ جلد ہی اُس کی دردناک چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ بالآخر جب دروازہ کھولا گیا تو بانو مر چکی تھی۔ بانو کو خاموشی سے دفن کر دینے کی کوشش کی گئی، لیکن دلاور منزل میں سبھی سازشی اور مخبر تھے، مقامی پولیس کو بانو کو دی گئی اذیت اور بعد ازاں اس کی موت کی اطلاع دے دی گئی۔ ماں صاب اور شقی القلب اللہ رکھی کا آپس میں جھگڑا ہو گیا کیوں کہ وہ جرم کی نزاکت کو سمجھ گئی تھیں اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگی تھیں۔

سنسنی خیز خبریں اس معاملے کو ہر طرف پھیلا رہی تھیں جب ماں صاب، سینئر بیگم آف جوناگڑھ، گھڑ دوڑ کی باقاعدہ شوقین، سوسائٹی کی مشہور شخصیت اور نواب جوناگڑھ کی بیوی، جنھوں نے اپنا دارالحکومت چھوڑنے سے پہلے ریاست کو پاکستان میں ضم کرنے کا کارنامہ انجام دیا تھا، جیل بھیج دی گئیں اور ان پر بانو کے قتل کی فردِ جرم عائد کی گئی۔

مجھے ان بدلتے ہوئے حالات سے خوف آنے لگا تھا، نہ صرف اِس لیے کہ میری عزیز اور خبطی دوست قتل کے الزام میں جیل پہنچ گئی تھیں، بلکہ اس لیے کہ پورا پاکستان جوناگڑھ خاندان کی عیاشی اور اخلاقی تباہی کو قریب سے دیکھ رہا تھا اور غالباً یہ سمجھ رہا تھا کہ سب شاہی خاندانوں کی طرزِ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جوں ہی مجھے پتا چلا کہ ماں صاب قتل کے الزام میں جیل گئی ہیں تو میں نے کوشش کی کہ کسی طرح صورتحال کو قابو میں لایا جائے۔ سب سے پہلے میں نواب جوناگڑھ کی رہائش گاہ پر گئی تو انھیں بالکل بے فکر اور لاتعلق پایا۔ میں نے ان سے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ میں سینئر بیگم کے ساتھ اُن کی ناراضگیوں سے آگاہ ہوں، لیکن اِس وقت جوناگڑھ خاندان کی

عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا، لہٰذا میں اکرم اللہ صاحب کے پاس گئی۔ اُنھیں ہمدردی تھی لیکن انھوں نے کہا کہ میں قانون میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ دلاور منزل پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ پولیس کو اطلاع دینے کے بارے میں ہر کوئی دوسرے پر شک کر رہا تھا۔

ان سخت مشکل دنوں کے بعد ماں صاب کے جیل میں لمبے قیام کی حقیقت سب کی سمجھ میں آگئی، جو جونا گڑھ خاندان کے لیے گویا ایک اکتا دینے والا معمول بن گیا تھا۔ دوست، رشتہ دار، سٹے باز اور کاروباری شرکاء کراچی جیل میں باقاعدگی سے ماں صاب سے ملتے رہتے اور روزانہ ان کا مخصوص کھانا اُنھیں پہنچایا جاتا۔

گو میں ماں صاب کے اس عمل سے دہل گئی تھی لیکن میری وفاداری نے مجھے باقاعدگی سے جیل میں اُن سے ملاقات کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔ ماں صاب نے چند ہفتوں ہی میں جیل کے سارے عملے کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ عملے نے انھیں زیادہ سے زیادہ سہولیات کے ساتھ رہائش فراہم کی۔ اُن کے کمرے نے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ جہاں چیف جیلر اور اُس کے ساتھی اُن کی خوشامد میں لگے رہتے تھے۔ ماں صاب نے مجھے رازداری سے بتایا کہ یہ احمق جیلر میری مُٹھی میں ہے۔

ماں صاب تقریباً دس ماہ جیل میں رہیں اور اُن کے وکلاء اُس الزامِ قتل کو، جس میں اُن کو قصوروار ٹھہرایا گیا تھا بلا ارادہ قتل قرار دلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ ماں صاب کو سزا میں مناسب تخفیف کے بعد رہا کر دیا گیا اور وہ بڑے فاتحانہ انداز سے دلاور منزل واپس گئیں۔ لیکن سابقہ طمطراق اور اصراف قصہ ماضی بن چکا تھا اور زیادہ تر زیورات بک چکے تھے۔ کراچی میں اُن کے باقی ماندہ سال غربت اور مایوسی میں گزرے۔ یہ میرے جاننے والوں میں ایک سب سے زیادہ دلچسپ اور رنگا رنگ شخصیت کا افسوس ناک انجام تھا۔

رام باغ سے آرام باغ تک

محمد عثمان دموہی اپنی کتاب ''کراچی تاریخ کے آئینے میں'' صفحہ نمبر 110 پر تقسیم سے قبل کراچی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات سے متعلق لکھتے ہیں کہ کراچی کے ہندو اور مسلمان باہم مل جل کے رہتے تھے اور دونوں آزادانہ طور پر اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے تھے۔ محرم میں مسلمان کراچی کی سڑکوں پر تعزیوں اور علم کے جلوس نکالتے تھے اور ہندو دسہرے میں نہایت دھوم دھام سے کالی مائی کا جلوس نکالتے تھے۔ ''رام باغ'' کے بارے میں صفحہ نمبر 738 پر وہ لکھتے ہیں کہ یہ کراچی کا ایک پرانا تفریحی باغ اور گراؤنڈ ہے۔ اس کے کچھ حصے پر سبزہ اور پھولوں کی کیاریاں ہے۔ یہ قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کے مذہبی اجتماعات کے لیے مخصوص تھا تاہم یہاں کبھی کبھی سیاسی جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔ اس باغ کے بارے میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں درج ہے کہ رام نے ہنگلاج (بلوچستان) جاتے ہوئے یہاں ایک رات قیام کیا تھا۔ تقسیم ہند کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی کراچی میں بسنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں اور مذہبی مقامات پر حملوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ نام ور محقق اور سیاسی تجزیہ نگار زاہد چوہدری نے اپنے کتابی سلسلے پاکستان کی سیاسی تاریخ کی جلد 6 جس کا عنوان ''سندھ مسئلہ خودمختاری کا آغاز'' ہے کے صفحہ نمبر 217 پر ہندو مُسلم فسادات کے معاملے پر لکھا ہے۔ ''ان حالات میں مولانا عبدالحامد بدایونی کی متحدہ جماعت کی تشکیل کے اگلے ہی دن یعنی 6 جنوری کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''آج رتن تالاب (کراچی) کے سکھ گوردوارے میں بدامنی کی افسوس ناک وارداتیں ہوئیں جہاں اڑھائی سو سکھ مرد عورتیں اور بچے بمبئی جانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ گوردوارے کو آگ لگا دی گئی۔ تقریباً 70

اشخاص زخمی ہوئے۔ مسلح پولیس فوراً پہنچی اور اس نے گولی چلا کر ہجوم کو منتشر کیا۔ بعد ازاں فساد توپ خانہ میدان اور ''رام باغ'' تک پھیل گیا۔ جہاں ہندوؤں کے بعض مکانات لوٹ لیے گئے۔ پولیس نے ہجوم پر قابو پانے کے لیے دو مقامات پر گولی چلائی۔ وزیر اعظم سندھ مسٹر کھوڑو مجسٹریٹ مسٹر رضا کی معیت میں فوراً گوردوارے پہنچے جہاں سے وہ دوسرے فساد زدہ علاقوں میں گئے اور ہندوؤں کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ سوراج بھون اور آریا سماج کی عمارت جلا دی گئی۔'' (ہماری کوشش ہے کہ سوراج بھون اور آریا سماج کی عمارتوں کو بھی تلاش کیا جائے) اس فساد کی خبر جب گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح کو پہنچی تو انھیں بہت رنج ہوا۔ زاہد چودھری کے مطابق انھوں نے فوراً اسکندر مرزا صاحب سیکریٹری وزارت دفاع کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ فلاں وقت تک مجھے رپورٹ ملنی چاہیے کہ شہر میں بالکل امن ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے کسی اور کو سیکریٹری دفاع مقرر کرنا پڑے گا۔ اسکندر مرزا نے یہ حکم سنتے ہی واپس آ کر کراچی کے کمانڈر جنرل، جنرل اکبر خان کو بلا کر وہی الفاظ ان سے کہے جو قائد اعظم نے ان سے کہے تھے۔ جنرل اکبر نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی۔ اس نے موقع پر پہنچ کر فسادیوں پر گولی چلائی جس سے گیارہ فسادی مارے گئے اور ایک زخمی ہوا۔ اس طرح قائد اعظم کی جانب سے مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے شہر میں امن و امان بحال ہو گیا۔ بحال ہونے والے علاقوں میں رام باغ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ منشی لام پرشاد ماتھر کی کتاب ''ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت'' کے صفحہ نمبر 45 پر رام رام کے عنوان سے انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہندوؤں نے پاک نام اور دعائے خیر کو بات پر ملانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً دو شخص مل کر ''جے رام جی'' یا ''جے سری کرشن'' کرتے ہیں۔ یعنی فتح یا بھلائی کی دعا کر کے بے غرضانہ طور پر اس کو رام یا کرشن ارپن کر دیتے ہیں اور ذاتی نفع کی خواہش معیوب سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ صرف رام رام ہی کہہ دیتے ہیں جس میں اس بے غرضی کا ذکر بھی نہیں ہونے پاتا۔ اگر تکلیف ہوتی ہے تو ''ہائے رام'' اگر خوشی ہوئی تو رام نے سن لی، یا رام نے دیا کی کہتے ہیں۔ بلکہ نفرت کے وقت بھی ''رام رام رام'' کہنے لگتے ہیں''۔ رام کا کردار ہندو مذہب میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ نامور قانون دان اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے

وائس چیئر مین امرناتھ موٹومل کے مطابق شری رام اپنے والد راجا دسرتھ کی بڑی اولاد تھے اور دسرتھ کے بعد تاج کے حق دار تھے۔ رامائن کے مُطابق ایک بار جب راجا دسرتھ جنگل میں شکار کر رہے تھے تو ایک سانپ نے اُنھیں ڈس لیا۔ اس موقع پر رام کی سوتیلی ماں رانی کیکئی نے اُن کی جان بچائی۔ راجا نے اس کے صلے میں رانی سے کہا کہ وہ کیا مانگنا چاہتی ہیں۔ رانی نے راجا سے کہا کہ وہ اس وقت کچھ نہیں چاہتی لیکن وقت آنے پر راجا کو اس کے دو وعدے پورے کرنے ہوں گے۔ راجا نے ہامی بھر لی۔ جب راجا دسرتھ مرنے کے قریب تھا اور اُس نے اپنے بڑے بیٹے رام کو راجا بنانا چاہا تو رام کی سوتیلی ماں نے راجا کو اپنے وعدے یاد لائے۔ رانی نے راجا سے کہا کہ ''رام'' کے بجائے اُس کے بیٹے ''بھرت'' کو راجا بنائے اور ''رام'' کو چودہ سال کے لیے بن واس (جنگل) بھیج دے۔ راجا دسرتھ نے نہ چاہتے ہوئے بھی رانی کی دونوں خواہشیں پوری کیں۔ رام نے ایک فرماں بردار بیٹے کا ثبوت دیتے ہوے باپ کے حُکم پر تخت وتاج چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ رام نے چودہ سال جنگل میں گزارے۔ راون سے جنگ لڑی اور کامیاب ہو کر چودہ سال بعد واپس اپنے وطن لوٹا۔ اس موقع پر رام کی آمد کی خوشی میں دیپ جلائے گئے۔ اس تہوار کو دیپاوالی کہا جاتا تھا۔ جو رفتہ رفتہ بگڑ کر دیوالی بن گیا۔ رام کی قربانی، فرماں برداری اور راون کو شکست دینے کی کہانی کو دسہرے کے تہوار کے دوران منایا جاتا ہے۔ تقسیم سے قبل اور اس کے بعد بھی کراچی میں رام لیلا کی کہانی اسٹیج پر پیش کی جاتی تھی۔ یہ اسٹیج رام باغ میں لگایا جاتا تھا۔ جس میں رام کے بن واس (جنگل) جانے اور واپسی تک کے تمام مراحل کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ نام ور ماہر تعلیم، دانش ور اور مترجم پروفیسر کرن سنگھ کا کہنا ہے کہ ''تقسیم ہند کے بعد ہونے والے فسادات کے سبب کراچی کے ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان منتقل ہو گئی تھی جس کے باعث ایک بڑے عرصے تک رام لیلا کراچی میں نہ ہو سکی، پھر لوگوں کی مصروفیات کے سبب یہ ممکن نہ رہا کہ رام لیلا کی کتھا دس دن تک اسٹیج پر پیش کی جا سکے۔ کراچی کا یہ رام باغ کہاں تھا جہاں دس دن تک رام لیلا کی کتھا اسٹیج پر ڈرامائی انداز میں پیش کی جاتی تھی؟ ہندوؤں کی ایک سماجی تنظیم کے عہدے دار نے اپنا نام نہ بتانے کی شرط پر ہمیں بتایا کہ رام باغ

سوامی نارائن مندر کے قریب واقع ایک پارک تھا، جہاں ایک اسٹیج بنایا جاتا تھا اور دس دن تک اس پر یہ ڈراما پیش کیا جاتا تھا۔ سوامی نارائن مندر اور اس کی تاریخ کا ذکر پھر کبھی سہی۔ ہم بات کر رہے تھے رام باغ کی تاریخ کے بارے میں موصوف نے مزید بتایا کہ رام باغ 1939ء میں ایک مخیّر ہندو شخص دیوان جیٹھانند نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ رام باغ اب بھی سوامی نارائن مندر کے قریب برنس روڈ پر موجود ہے۔ اس رام باغ کی آخری نشانی باغ سے کچھ دور ہمدرد دواخانے والی سڑک پر بجلی کے ایک کھمبے پر لگی شکستہ پلیٹ ہے، جس کو اگر غور سے پڑھا جائے تو رام باغ روڈ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ رام باغ اب بھی موجود ہے لیکن اب یہاں رام لیلا کی کتھا پیش نہیں کی جاتی۔ رام باغ میں رام لیلا کی کتھا پیش کرنے کے لیے جو اسٹیج تھا وہاں ایک عالیشان مسجد قائم ہے۔ جہاں پنجگانہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ کراچی کے باسی رام باغ کو اب آرام باغ کے نام سے جانتے ہیں۔

❊

ٹھگوں کی دُنیا دورِ قدیم سے عصرِ حاضر تک

کہتے ہیں کہ پاکستان میں ایک کاروبار جو ہر وقت عروج پر رہتا ہے وہ ٹھگی کا کاروبار ہے۔ دکان دار آئے دن اشیائے خورونوش کے نرخ ٹھگی سے بڑھا دیتے ہیں ہیں۔ یہی حال ٹرانسپورٹ کا ہے، ہم یہ سمجھے تھے کہ کراچی میں ٹیکسیاں ختم ہونے کے بعد جو رینٹ اے کار کی کمپنیاں آئی تھیں، ان کے نرخ نسبتاً کم ہوں گے اور تھے بھی، لیکن اب انھوں نے بھی ٹھگی کے نئے نئے ذریعے نکال لیے ہیں۔ جہاں یہ گاڑیاں پہلے 250 روپے میں جاتی تھیں اب دورانِ سفر رش کے اوقات کے نام پر ٹھگی کر کے دوسو پچاس کی جگہ پانچ سو روپے وصول کرتے ہیں۔ موبائل فون کمپنیاں بھی سو روپے کا بیلنس جمع کرانے کے بعد 47 روپے مختلف ٹیکسوں کی مد میں کاٹ لیتی ہیں۔ چیف جسٹس صاحب نے اس بات کا نوٹس لیا تو کچھ عرصے کے لیے ٹیکس کٹوتی کی مد میں عوام کو ریلیف ملا۔

ہمارا موضوع متحدہ ہندوستان کے وہ سنگ دل ٹھگ ہیں جو مسافروں کو لوٹنے کے بعد انھیں قتل کرنا اپنے ٹھگی کے پیشے کا حصہ سمجھتے تھے۔ یہ اتنے سفاک تھے کہ اس کشت وخون کو بالکل جائز سمجھتے تھے۔ بہرام نامی ایک ٹھگ کا دعویٰ تھا کہ اُس نے چالیس سال کے عرصے میں 900 سے زائد افراد کو قتل کیا ہے۔ سلیمن (ایک انگریز افسر) کو اس بات پر ذرّہ برابر بھی یقین نہیں آیا اُس نے استفسار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ اتنی بڑی تعداد میں قتال کا تم پر الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ بہرام نے مودبانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ تو وہ افراد ہیں جن کا قتل مُجھے یاد ہے، میں تعداد یاد کرتے کرتے اتنا عاجز آ گیا تھا کہ میں نے گنتی کرنی ہی چھوڑ دی تھی۔ سلیمن نے دوبارہ سوال پوچھا کہ تمھیں کسی کو قتل کرتے وقت رنج نہیں ہوتا، پہلے تم اُن سے میل ملاپ بڑھاتے تھے

پھر دھوکے کے ذریعے انھیں قتل کر دیتے تھے۔ جواباً بہرام نے کہا کہ" ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے یہ شکار کا کھیل ہے۔ اگر کوئی شکاری شکار کا پیچھا کرے تو اُسے کیا مُسرت کا احساس نہیں ہوتا۔ شکاری شکار کو گھیرنے کے لیے تمام حربے اور ترکیبیں استعمال کرتا ہے، کیا اُسے اس وقت بھی خوشی نہیں ہوتی جب شکار اُس کے قدموں میں بے جان پڑا ہوتا ہے، تو ٹھگوں کے لیے بھی یہ تمام عمل ایسا ہی ہے۔

آخر وہ کیا وجہ تھی کہ ٹھگوں نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا قتل عام کیا مگر اس کے باوجود اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ معروف مورخ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "تاریخ ٹھگ اور ڈاکو" میں رقم طراز ہیں کہ: ٹھگوں کے گروہوں کو اس وجہ سے بھی ختم نہیں کیا جا سکا کہ بڑے بڑے زمین دار اور ریاستوں کے حکمران ان کی حفاظت کرتے تھے۔ ان کی لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ مقرر کرتے تھے۔ بعد میں اس کے بھی شواہد ملے کہ برطانوی علاقوں کی پولیس بھی ان کے ساتھ شامل ہوتی تھی اور اکثر مقدمات میں مجسٹریٹ رشوت لے کر انھیں چھوڑ دیتے تھے۔ چونکہ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ اپنے خلاف کوئی شہادت نہیں چھوڑتے تھے اور مارنے کے بعد لاشوں کو دفن کر کے تمام نشانات مٹا دیتے تھے، اس لیے قتل کی کوئی شہادت باقی نہیں رہتی تھی۔ رہا لوٹ کا مال تو اس کی فروخت وہ جاننے والے ساہوکاروں اور بنیوں کے ہاتھوں کرتے تھے۔

ابتدا میں کچھ ٹھگوں پر قتل کے الزام میں مقدمے بھی چلے مگر وہ بَری کر دیے گئے۔ کیونکہ ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھے۔ مگر انیسویں صدی کی ابتدا میں یہ مسئلہ حکومت برطانیہ کے لیے اہمیت اختیار کر گیا کیونکہ اس قسم کی متواتر رپورٹیں ملیں کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مسافر غائب ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

ٹھگ پاک و ہند میں تقسیم سے پہلے ایک منظم گروہ تھا۔ ان کے اپنے قاعدے اور قانون تھے۔ حد تو یہ تھی کہ آہستہ آہستہ ٹھگی نے ایک مذہبی فرقے کی شکل بنا لی تھی۔ یہ وارداتیں اپنے اصول وضوابط کے تحت کرتے تھے اور ٹھگی کرنے والے ہر ٹھگ پر لازم تھا کہ وہ ان قوانین کی پاس داری کرے۔ ٹھگی

کے ذریعے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا ایسا نظام مرتب کیا گیا تھا جو دو صدیوں تک ہندوستان پر مسلط رہا۔ اِس دوران ان ٹھگوں نے بے شمار تاجروں اور مسافروں کو لوٹا بلکہ انھیں قتل بھی کیا۔ برطانوی راج نے بالآخر تنگ آ کر اس پورے نظام کو ملیا میٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ معروف محقق ڈاکٹر خلیق انجم اس بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

اردو ادب میں بھی ٹھگوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ نام ور ادیب اور ناول نگار مرزا ہادی رُسوا اپنی کتاب ''امراؤ جانِ ادا'' میں ٹھگوں کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

عیال و مال نے روکا ہے دم کو آنکھوں میں

یہ ٹھگ ہٹیں، تو مسافر کو راستہ مل جائے

لوٹ کے گھر لے گئے ٹھگ! ٹھگ کے ہم کو کھا گئے!

خانصاحب! تم ہماری جان کے قزاق ہو

ع: ٹھگ لیا اُس نے ہم کو جُل دے کر۔

دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عوام الناس ایسے تمام گروہوں یا افراد کو بُرا سمجھتے تھے جو درپردہ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوتے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر ان لوگوں کی بُرائی کرتے تھے لیکن اپنے مفادات کے حصول کے لیے اُن کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اِس سلسلے میں اگر ہم صرف کراچی کو اپنا موضوع بنائیں تو پاکستان کی تاریخ میں ایسے سیاسی لوگ جا بہ جا نظر آئیں گے جنھوں نے جرائم پیشہ افراد کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ ماضی قریب میں ہندوستان میں یہ لوگ ٹھگ ہوتے تھے لیکن عصرِ حاضر میں ان کو بھتہ خور، لینڈ مافیا، اغوا برائے تاوان اور ایسے بے شمار ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے یہ جرائم پیشہ افراد ویسے ہی ہیں جیسے ماضی میں ٹھگ ہوتے تھے۔ ان میں کوئی ذات پات زبان، قوم اور مذہب کی تفریق نہیں ہوتی۔

ہندوستان میں مسلمان اور ہندو ٹھگوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ ہاں بعض علاقوں میں مسلمان ٹھگوں کی تعداد زیادہ تھی اور بعض علاقوں میں ہندو ٹھگ زیادہ تھے۔ اس کا تعلق اُن بستیوں

اور شہروں کے تناسب آبادی سے ہوگا جو ٹھگوں کے خاص مرکز تھے۔ ایک وعدہ معاف پُرانے ٹھگ فرنگیا کے بیان کے مطابق اودھ کے علاقے میں نوے فی صدی مسلمان ٹھگ تھے۔ دوآبے کے علاقے میں تقریباً اسی فی صدی ہندو تھے۔ دریائے نربدا کے جنوبی علاقے میں مسلمان ٹھگ پچھتّر فی صدی تھے۔ بُندیل کھنڈ اور ساگر کے علاقے میں ہندو اور مسلمان آدھے آدھے ہوں گے۔ راجستھان میں مسلمان ٹھگ پچیس فی صدی ہوں گے۔ بنگال، بہار اور اُڑیسہ میں ہندو مسلمان تعداد میں کم و بیش برابر ہوں گے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ یہ محض اندازہ ہے اور اُس کی یہ بات بجائے خود درست ہے [رماسیانا اوّل، ص178]۔ یہ اندازہ سہی، لیکن اِس سے تعداد کے لحاظ سے صورتِ حال کی کچھ نہ کچھ یا یوں کہیے کہ اچھی خاصی وضاحت ضرور ہو جاتی ہے۔

ٹھگ ہندو ہو یا مسلمان، وہ کالی دیوی کو حاکمِ مطلق مانتا تھا اور اُس کے احکام کو واجبُ العمل۔ یہ اُس کے عقیدے کا جُز تھا۔ ایک ہندو کے لیے دیوی کو ماننا کوئی خاص بات نہیں تھی، البتہ کسی مسلمان کے لیے یہ واضح طور پر تضاد تھا کہ وہ اپنے خدا اور پیغمبر کو بھی مانے اور دیوی کو بھی۔ رماسیانا میں مختلف ٹھگوں کے عدالتی اظہار کے تحت اور انفرادی گفتگو میں یہ مسئلہ بار بار زیرِ گفتگو آیا ہے۔ سبھی مسلمان ٹھگوں نے متفقہ طور پر یہ بیان دیا ہے کہ خدا کو اور اُس کے رسول کو ماننے میں اور دیوی کو ماننے میں کچھ تضاد نہیں۔ ہم خدا کو مانتے ہیں، اُس کے رسول کو مانتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، دوسرے اسلامی احکامات کی بھی پابندی کرتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اس دنیا میں دیوی کے احکام کو ماننا ہمارے لیے لازم ہے۔ وہ اس دُنیا میں ہمارے تحفّظ کی ذمّے دار ہے۔ چونکہ وہ بھی ایک آسمانی طاقت ہے، اِس لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اس دُنیا میں اُس کے احکام کو مانیں گے، تو اُس دنیا میں خدا کی طرف سے ہم کو کسی طرح کی سزا نہیں ملے گی۔

اس سلسلے میں تسکینِ خاطر کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی کہ کالی دیوی کو تو سبھی مانیں گے کہ وہ ٹھگوں کی محافظ ہے؛ اِس کے بعد دوسری سطح پر ہندو بالمیک کو مانتے ہیں مرشد کے طور پر۔ وہ بالمیک کو برہمن مانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اُس کا اصل نام دُجا دُھم تھا۔ اور مسلمان ٹھگ حضرت نظام الدین اولیا کو مانتے ہیں اور اُن کے ''مزار کی زیارت کو سعادت دارین تصور کرتے

ہیں'' [مصلحاتِ ٹھگی، تحتِ ''نظام الدین اولیا'']۔ یہ دراصل مجرمانہ نفسیات کی تسکین تراشی ہے۔ ہندو اور مسلمان، دونوں نے ذہنی اور نفسیاتی سہارے کی صورت پیدا کرلی تھی۔ اس طرح احساسِ جُرم کی خلش پیدا نہیں ہو پاتی تھی اور پیدا ہو تو یہ من گھڑت سہارے اُس کو ختم کردیتے تھے۔ بہ ہر طور، ٹھگوں کے معتقدات کے ذیل میں عقیدے کا یہ، تضاد اور اُس تضاد سے ذہنی طور پر نجات پانے کی تدبیریں مطالعے کا دلچسپ موضوع بن سکتی ہیں۔

ٹھگوں کے گروہ مشترکہ ہندوستان میں ایک طویل عرصے سے کام کر رہے تھے لیکن انھیں کھلی چھوٹ اُس وقت ملی جب شاہ جہان ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ ولیم سلیمن اپنی کتاب رماسیانا کے صفحہ نمبر 32 سے 33 تک میں اس کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے:

ٹھگی ہندوستان میں خاصے پُرانے زمانے سے پائی جاتی تھی، البتہ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے بعد سے اِس میں اضافہ ہوا۔ جیسے جیسے مغل حکومت کمزور پڑتی گئی، اُسی نسبت سے نظم ونسق میں ابتری پھیلی اور اُسی نسبت سے ٹھگوں کو اپنے کام کے لیے نہایت سازگار ماحول ملتا گیا۔ اٹھارویں صدی اور اُنیسویں صدی کا رُبع اوّل اِس کے عروج کا زمانہ ہے۔ بدنظمی اور انتشار نے ٹھگوں کے لیے بہت سازگار حالات پیدا کردیے تھے۔ راستے جس قدر ویران اور غیر محفوظ ہوتے تھے، ٹھگوں کے لیے اُتنی ہی آسانیاں فراہم ہوجاتی تھیں۔ چونکہ ٹھگی کا سارا عمل عموماً آبادیوں سے دور ویران مقامات اور راستوں پر انجام پاتا تھا اور مقتولوں کو ایسے مقامات پر گاڑ دیا جاتا تھا کہ کسی کو اُن کی خبر تک نہیں مل پاتی تھی، اِس لیے لوگوں کو اس غارت گری کا احوال معلوم ہی نہیں ہو پاتا تھا۔

ٹھگوں کے گروہ اِس قدر منظم اور تربیت یافتہ ہوتے تھے کہ شروع سے آخر تک، یعنی مسافروں کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے سے لے کر اُن کے قتل تک سارے کام مقررہ طریقوں کے مطابق انجام پاتے تھے۔ پھر کام کی باتیں یہ لوگ اپنی زبان میں کیا کرتے تھے جس سے دوسرے واقف نہیں ہوتے تھے، یوں اِن کی کارکردگی کا حال کسی پر آشکار نہیں ہو پاتا تھا۔ اِس کا کچھ اندازہ اِسی ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ سلیمن نے رماسیا میں لکھا ہے کہ جہاں میں سرکاری

فرائض انجام دیتا تھا (1822 سے 1824 تک)، اُس کے قریبی علاقے میں ٹھگوں کا عمل دخل تھا اور میں اِس قدر بے خبر تھا اِس صورتِ حال سے کہ اگر کوئی شخص مجھ سے کہتا کہ اِس علاقے میں لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے تو میں اُسے دیوانہ سمجھتا۔

ٹھگوں کی مختلف قسمیں آج بھی ہمیں اپنے معاشرے میں نظر آتی ہیں۔ کوئی سیاسی ٹھگ ہے تو کوئی ادبی ٹھگ، کوئی ایک ٹھگوں کا گروہ کسی ایک خاتون کی شادی کئی لوگوں سے کرواتا ہے اور پہلی رات کے بعد ہر دولہا کا مال واسباب لوٹ کر فرار ہو جاتا ہے۔ اکثر ٹرینوں اور بسوں میں لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ ٹھگ کھانے پینے کی اشیاء میں نشہ آور چیزیں ملا کر اُن کو لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ٹھگ لوگوں کو قتل نہیں کرتے۔ ہندوستان میں ٹھگی کے خاتمے کا سہرا ایک انگریز فوجی افسر کیپٹن ولیم سلیمن کو جاتا ہے۔ معروف محقق خلیق انجم، علی اکبر الہ آبادی کی کتاب مصطلحاتِ ٹھگی کے حرفِ آغاز میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

ٹھگی قتل اور لوٹ مار کا ایک ایسا منظم طریقہ تھا، جو تقریباً دو سال تک ہندوستان میں رائج رہا۔ میری معلومات کے مطابق کسی بھی ملک میں ٹھگی کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ٹھگی محض ایک لوٹ مار اور قتل و غارت گری نہیں تھی بلکہ اُس نے ایک خاص مذہبی فرقے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اُس کے باقاعدہ اصول وضوابط تھے۔ اس مسلک کے پیروکاروں کے ایسے عقائد تھے، جن کی پابندی ہر ٹھگ کے لیے لازمی تھی۔ وہ اپنے اصول وضوابط کے تحت مخصوص لوگوں کو ہی قتل کرتے تھے، جس کا خان صاحب نے اپنے مقدمے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

برطانوی حکومت نے ٹھگی کے انسداد کا کام 1799 میں شروع کیا، لیکن غالباً بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ 1830 میں ہندوستان کے گورنر جنرل ولیم بینٹنک نے ٹھگی کو ختم کرنے کی ایک مہم تیار کی تھی اور اس مہم کا انچارج کیپٹن ولیم سلیمن کو بنایا۔ سلیمن کا بیان ہے کہ 1835 تک بیشتر ٹھگ پکڑے جا چکے تھے اور ٹھگوں کے منظم گروہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ سلیمن کے دو بڑے کارنامے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے ٹھگی بالکل ختم کر دی اور دوسرے انھوں نے بعض ٹھگوں کو وعدہ معاف گواہ بنا کر اُن سے ٹھگی کے اصول، قواعد اور طریقہ کار کے بارے میں معلومات

حاصل کیں۔ وعدہ معاف گواہوں کی تعداد لگ بھگ چار سوتھی۔ اگر چہ سلیمن کے پاس مختصری فوج اور انتظامیہ کے افسر تھے، لیکن اس نے جس منظم طریقے سے کام کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1831 سے 1837 کے عرصے میں تیس ہزار ٹھگوں پر مقدمہ چلا کر انھیں سزا دی گئی۔ ان میں سے اکثریت کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور کچھ کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ان سب کے بیانات کو بڑے سلیقے سے مرتب کر کے سلیمن نے Rama seeana نام کی ایک کتاب مرتب کی۔ سلیمن نے ایک کام یہ بھی کیا کہ ٹھگوں سے اُن کے خفیہ زبان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ایک فرہنگ مرتب کی۔

❊

قائداعظم کے اپنی بیٹی دینا سے تعلقات کیسے تھے؟

قائدِاعظم محمد علی جناح کی اکلوتی بیٹی دینا جناح 2 نومبر 2017 کو 98 برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے رتی جناح کی موت کے بعد دینا جناح کو بڑے ناز ونعم سے پالا، دینا کو باپ کی طرف سے ہر طرح کی آزادی تھی، جس کے نتائج قائدِاعظم کی مرضی کے خلاف نکلے اس کا ذکر آگے چل کر کریں گے۔

دینا جناح نے ابتدائی تعلیم بمبئی کے ایک کانوینٹ اسکول میں حاصل کی۔ دینا اگرچہ بیشتر وقت اپنی نانی کے ہاں گزارتی تھیں لیکن اس کے باوجود جناح صاحب نے دینا کی پرورش اور دیکھ بھال کے لیے ایک گورنس کو ملازم رکھا تھا۔ جناح صاحب کی پیشہ ورانہ اور سیاسی مصروفیات کی بناء پر اُن کو دینا کے ساتھ وقت گزارنے کے مواقع کم ہی میسر آتے تھے۔ رتی جناح کے انتقال کے وقت دینا کی عمر ساڑھے 9 سال تھی اور اتنے کم عمر بچے کے لیے یہ صدمہ بہت گہرا تھا۔ جناح صاحب نے اِس صدمے کے اثر کو کم کرنے کے لیے گھر میں اپنی بیٹی کے لیے تفریحِ طبع کے انتظامات بھی کر رکھے تھے اور اس کے علاوہ وہ دینا کو اکثر شاپنگ کروانے بھی لے جاتے تھے۔

1930 میں جب وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو فاطمہ جناح اور دینا کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ دینا کو لندن کے ایک اسکول میں داخل کروادیا۔ وہاں رہائش کے لیے ایک مکان بھی خریدلیا۔ لندن میں جناح صاحب کی زندگی کافی پُرسکون تھی۔ ہفتے اور اتوار کا دن وہ اپنی بیٹی کے ساتھ گزارا کرتے تھے۔ جنوری 1934 میں جناح صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی درخواست پر دوبارہ ہندوستان لوٹے جبکہ دینا اور فاطمہ جناح لندن ہی میں مقیم رہیں۔ 24

مئی 1934 کو انھیں ایک بار پھر لندن جانا پڑا اور جب اگلی مرتبہ وہ ہندوستان لوٹے تو فاطمہ جناح اور دینا جناح بھی اُن کے ہمراہ تھیں۔

دینا بہت شوخ اور چنچل تھیں، وہ فاطمہ جناح سے چھپ چھپا کر ملازمین کو پیسے بھی دیا کرتی تھیں۔ خواجہ رضی حیدر اپنی کتاب رتی جناح قائداعظم کی رفیقۂ حیات کے صفحہ نمبر 146 پر لکھتے ہیں کہ سید عبدالحئی، جو جناح صاحب کے ملازم تھے، انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

''محمد علی جناح کے پاس اُس وقت 5 گاڑیاں تھیں۔ دینا جناح کو کار چلانے کا بہت شوق تھا لیکن جناح صاحب مجھے منع کرتے تھے کہ دینا کو کار چلانے کو مت دیا کرو لیکن وہ اکثر مجھ سے ضد کر کے کار لے لیتی تھیں اور بمبئی کی مضافاتی سڑکوں پر بہت تیز ڈرائیونگ کرتی تھیں۔ اُن کو موسیقی اور عمدہ کپڑے پہننے کا بھی شوق تھا۔ ہم جب خریداری کر کے لوٹتے تو محترمہ فاطمہ جناح دینا کے بارے میں دریافت کرتی تھیں کہ وہ کہاں گئی تھیں؟ انھوں نے کیا خریدا؟ جناح صاحب بھی اکثر مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا دینا نے کار چلائی تھی مگر میں ہمیشہ جھوٹ بول دیا کرتا تھا۔''

خواجہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

مسلم لیگ کی تنظیم نو کی وجہ سے اُنھیں کئی کئی ماہ بمبئی سے باہر رہنا پڑتا تھا اور ایسی صورت حال میں دینا زیادہ وقت اپنی نانی کے ہاں گزارتی تھیں۔ جب دینا جناح نے امیر و کبیر نوجوان نیول واڈیا سے شادی کا فیصلہ کیا جو پارسی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کر چکا تھا، تو ننھیال والوں نے اس فیصلے کی مکمل حمایت کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے لیے یہ صورتحال تشویش ناک اور پریشان کن تھی۔ قائدِاعظم نے بڑی کوشش کی کہ یہ شادی نہ ہو سکے۔ لیکن دینا نے اُن کی ایک نہ مانی۔ دینا کی شادی ایک ایسے موقع پر ہوئی تھی جب جناح صاحب برِصغیر کے مسلمانوں کے واحد رہنما تھے اور اُن کی بیٹی ایک غیر مسلم سے شادی کر رہی تھی۔ یہ بات جناح صاحب کے لیے کسی صدمے سے کم نہ تھی جب کہ دینا کی والدہ رتی کا تعلق بھی ایک پارسی خاندان سے تھا۔ وہ جناح صاحب کے ذاتی دوست ڈنشا پیٹ کی بیٹی تھیں۔

شریف الدین پیرزادہ کے مطابق جناح صاحب نے رتی کا رشتہ بہت دلچسپ انداز میں سر ڈنشا پٹیٹ سے طلب کیا تھا۔ انھوں نے ایک دعوت میں سر ڈنشا سے دریافت کیا کہ بین المذاہب شادیوں کے بارے میں اُن کا کیا خیال ہے تو انھوں نے جواباً کہا کہ یہ ایک اچھا عمل ہوگا۔ اِس سے مختلف مذاہب کے درمیان نفرتیں اور دوریاں کم ہوں گی۔

اُس موقع پر قائداعظم نے اُن سے کہا کہ وہ اُن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، جسے سن کر ڈنشا پٹیٹ ہکا بکا رہ گئے اور اُنھوں نے آخری حد تک کوشش کی کہ یہ شادی نہ ہو لیکن یہ شادی ہو کر رہی۔ اِسی طرح جناح صاحب نے بھی کوشش کی کہ دینا کسی طرح اِس شادی سے باز آجائے۔ ایم سی چھاگلہ اپنی کتاب سرمائی پھول Roses in December کے صفحہ نمبر 120 پر لکھتے ہیں کہ جناح صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں دینا سے کہا کہ ہندوستان میں کروڑوں مسلم لڑکے ہیں وہ جس کو چاہے منتخب کرلے۔ تب نوجوان لڑکی، جو اپنے والد سے کسی حد تک مشابہہ تھی، نے جواب دیا کہ ابا! ہندوستان میں کروڑوں مسلمان لڑکیاں بھی موجود تھیں تو آپ نے اُن میں سے کسی کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی؟

دینا کے اِس فیصلے کے بعد جناح صاحب نے اپنی بیٹی سے اپنے تعلقات محدود کرلیے۔ لیکن باپ تو آخر باپ ہوتا ہے وہ کبھی کبھار اپنے ڈرائیور عبدالحیٔ کے ذریعے دینا کی خیریت معلوم کرلیتے تھے۔ 1938 کے آغاز میں دینا کی نیول واڈیا سے مسیحی رسوم کے مطابق شادی ہوئی، جناح صاحب شدید علیل تھے، لیکن اُس موقع پر انھوں نے اپنے ڈرائیور سید عبدالحیٔ کے ذریعے ایک گلدستہ شادی کی تقریب میں بھیجا۔

فضل حق قریشی اپنی کتاب Early days with the Qaid e Azam مطبوعہ 1976 کے صفحہ نمبر 137-136 پر رقم طراز ہیں کہ دینا واڈیا نے 23 اپریل 1970 کو Pakistan Time لاہور کے ایک نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

''بانی پاکستان نے اسلامی اصولوں کی پاس داری میں اپنے قریب ترین اور عزیز ترین تعلقات کو ترک کردیا۔ انھوں نے اپنے مذہب کے تقدس کی خاطر اپنے خونی رشتوں سے بھی

لاتعلقی اختیار کرلی۔ میرے والد عظمت کی علامت تھے۔ ایسی عظمت جس کا الفاظ میں احاطہ کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ دینا نے نم ناک آنکھوں، گلوگیر آواز اور نہایت جذباتی انداز میں نامہ نگار سے کہا کہ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے لیکن جب میں نے ایک غیر مسلم سے شادی کا فیصلہ کیا تو اُن کو مجھ سے تعلق ختم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔''

دینا واڈیا کے مطابق جناح نے اُس موقع پر کہا کہ ''اگر تمھارا فیصلہ ہے تو پھر میرا فیصلہ بھی سن لو۔ یہ شادی تم کو مذہب اسلام سے خارج کردے گی اور اُس کے بعد تم میری بیٹی نہیں رہو گی کیونکہ ترک مذہب کے بعد اسلام خونی رشتوں کو بھی قبول نہیں کرتا۔''

دینا واڈیا نے مزید کہا کہ:

> مجھے اِس بات کا اُس وقت الم ناک ثبوت ملا جب مجھ کو معلوم ہوا کے اُن کے ذاتی احکامات کے تحت مجھے اُس وقت ویزا نہیں دیا گیا جب میں اُن سے اُن کے آخری لمحات میں ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ یہ دراصل میرے لیے سزا تھی میرے اُس عمل کی کہ جب میں نے ایام جوانی میں اُن کا دل دکھایا تھا اور اُن کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔

دینا اپنے والد کو خطوط بھی تحریر کرتی تھیں اور یہ تمام خطوط قائدِاعظم اکیڈمی کراچی میں موجود ہیں، اگر کوئی محقق اِس پر تحقیق کرنا چاہے تو یہ مواد اتنا زیادہ ہے کہ اِس پر جامع کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ دینا نے قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں رہائش اختیار نہیں کی اور وہ بھارت ہی میں رہیں۔ قائداعظم اکیڈمی کے ڈائریکٹر، خواجہ رضی حیدر نے بتایا کہ جناح صاحب کے انتقال کے بعد وہ ایک چارٹرڈ طیارے کے ذریعے کراچی آئیں اور کچھ دن محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ رہنے کے بعد دوبارہ بمبئی چلی گئیں۔ اُس دوران انھوں نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قائداعظم نے اپنی بیٹی کو جائیداد سے عاق کردیا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی بلکہ انھوں نے اپنی وصیت میں اپنی بیٹی کے لیے دو لاکھ روپے مختص کیے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ انھوں نے بیٹی کا نام نہیں لکھا۔

دینا جناح کے معاملے میں جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جناح صاحب نے اُن کو اپنی زندگی سے مکمل طور پر نکال دیا تھا اُن کے لیے دینا جناح کا یہ بیان پڑھنا ضروری ہے:

میرے والد ظاہر دار نہیں تھے بلکہ وہ ایک شفیق باپ تھے۔ میری اُن سے آخری ملاقات بمبئی میں 1946 میں ہوئی۔ وہ نہایت اہم مذاکرات کے لیے دہلی سے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ٹیلی فون پر مجھے اور میرے بچوں کو چائے پر مدعو کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ دینا (دینا جناح کی بیٹی کا نام بھی دینا ہے) پانچ سال کی اور نسلی دو سال کا تھا۔ ہم بیشتر وقت بچوں اور سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے رہے انھوں نے مجھے بتایا کہ پاکستان وجود میں آرہا ہے۔ دہلی میں اپنی ناگزیر مصروفیات کے باوجود انھوں نے ہمارے لیے تحائف خریدنے کا وقت نکال لیا تھا۔ جب ہم نے اُن کو خدا حافظ کہا تو وہ نسلی کو پیار کرنے کے لیے جھکے اور وہ خاکستری ٹوپی جواب اُن کے نام سے مشہور ہے، نسلی کو پسند آ گئی۔ انھوں نے فوراً ہی وہ ٹوپی اتار کر اپنے نواسے کے سر پر رکھ دی اور بولے، اِسے تم رکھ لو میرے بیٹے۔ 'نسلی' آج بھی اُس ٹوپی کو بہت عزیز رکھتا ہے مجھے اُن کی دل جوئی کی یہ ادا یاد ہے کیونکہ یہ اُن کی اِس محبت کی ایک خصوصیت تھی جو وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔

*

قائدِاعظم کی جائے پیدائش: اوریجنل یا چائنا؟

ایک بار ہمارے ایک دوست نے ایک بچے کی امتحانی کاپی کا ایک صفحہ فیس بک پر شیئر کیا تھا جس نے اوریجنل کی ضد چائنا لکھی تھی۔

میں نے اپنے دوست اور رشتے میں بھتیجے محسن سومرو سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ بہت ہنسے اور مجھ سے کہا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کو اوریجنل اور چائنا پر کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ محسن بھی گھر چلا گیا اور میں بھی اپنے گھر، لیکن یہ کانٹا میرے ذہن میں چبھتا رہا۔

پھر میں نے خود بھی سوچا کہ ہمارے یہاں ان اصطلاحات اوریجنل اور چائنا کی کیا اہمیت ہے۔ پاکستان میں آپ کوئی بھی الیکٹرانک چیز خریدیں، خواہ وہ فریج ہو یا کچھ اور، دکان دار آپ سے پہلا سوال یہ پوچھتا ہے کہ اوریجنل چاہیے یا چائنا؟

اب ہم جناح صاحب کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں ایک کہانی بیان کررہے ہیں۔ اس کہانی کے آخر میں یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کیا اوریجنل ہے اور کیا چائنا۔

قائدِاعظم محمد علی جناح کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے معاملے پر تضادات پائے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اس حوالے سے دستاویزی ثبوت بھی موجود ہیں۔ تاریخِ پیدائش کے بارے میں دو مختلف تاریخوں کا معروف دانشور جی الانا نے قائداعظم کی سوانحِ حیات میں ذکر کیا ہے۔

کتابی صورت میں یہ سوانحِ حیات پہلی بار انگریزی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ رئیس امروہوی نے کیا ہے۔ اردو ترجمہ ''قائدِاعظم جناح: ایک قوم کی سرگزشت'' کے نام سے شائع ہوا، مصنف: جی۔ الانا، مترجم رئیس امروہوی۔ فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور۔ راولپنڈی۔

کراچی۔

کتاب کے صفحہ نمبر 19 پر رقم ہے کہ:

سندھ مدرسۃ الاسلام کے انگریزی شعبے میں داخل ہونے والے طالب علموں کے جنرل رجسٹر سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کو اس اسکول میں 4 جولائی 1887 کو داخل کیا گیا تھا اور وہ 114 ویں طالب علم تھے۔ اندراجات کے مطابق اُن کا نام محمد علی جناح اور جائے پیدائش کراچی تھی۔ یومِ پیدائش درج نہ تھا۔ عمر: 14 سال، فرقہ: خوجہ، سابقہ تعلیم: اسٹینڈرڈ چہارم گجراتی، فیس: ادا کی جائے گی۔

دوسرا اندراج جس کا نمبر شمار 178 ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ:

23 ستمبر 1887 کو محمد علی جناح کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں دوبارہ داخل کیا گیا۔ اب کی بار ان کی تاریخِ پیدائش 20 اکتوبر 1875 اور سابقہ تعلیم کے خانے میں انجمن اسلام بمبئی اسٹینڈرڈ اوّل درج کی گئی۔

9 فروری 1891 کے ذیل میں جو کوائف بیان کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

نام: محمد علی جناح بھائی۔ جائے پیدائش: کراچی۔ تاریخ پیدائش: 20 اکتوبر 1875۔ فرقہ: خوجہ۔ سابقہ تعلیم: اسٹینڈرڈ چہارم۔ فیس ادا کی گئی کہ نہیں: ادا کی گئی۔

ان دو مستند اندراجات کے سبب 25 دسمبر 1876 کی صحت کے بارے میں شبہ ہوتا ہے، لیکن اس امر سے زیادہ مستند کیا بات ہو سکتی ہے کہ قائدِ اعظم نے ہمیشہ اپنی سالگرہ 25 دسمبر کو منائی۔ سندھ مدرسے کے رجسٹر کے اندراج کے مطابق اس اسکول میں طالب علمی کے دوران میں ان کے نام کی ہجے دو مرتبہ تبدیل ہوئی۔

صحافی، شاعر اور محقق مظہر لغاری کے مطابق:

سندھ میں عام طور پر مانا جاتا ہے کہ جناح 20 اکتوبر 1875 کو ٹھٹھہ ضلعے کے ایک قصبے جھرک میں پیدا ہوئے۔ سروجنی نائیڈو، جنھوں نے ان کی پہلی سوانح لکھی،

نے اُن کی تاریخ پیدائش 25 دسمبر 1876 لکھی ہے اور اس کے لیے ان کے پاسپورٹ میں درج تاریخ پیدائش کا حوالہ دیا۔ اس زمانے میں ٹھٹھہ ضلع کراچی کا حصہ تھا۔

سابق وزیر ثقافت سسّی پلیجو کے مطابق:

1990 میں کیے گئے تحقیقی کام سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جناح جھرک میں پیدا ہوئے۔ 1950 میں سندھی ادبی بورڈ کی چھپنے والی درسی کتابیں جو بڑا عرصہ چلیں، ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز داؤد پوتہ نے لکھیں۔ فاطمہ جناح اس وقت تک زندہ تھیں جب یہ کتابیں پرائمری اسکولوں میں پڑھائی جاتی رہیں، انھوں نے ان پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔

ڈاکٹر کلیم لاشاری کا کہنا ہے کہ:

ان کی تحقیق کے مطابق جناح ایک ایسے گھر میں پیدا ہوئے تھے جو اس پلاٹ کے قریب واقع تھا جہاں وزیر مینشن تعمیر ہوا، مگر وزیر مینشن میں نہیں، کیونکہ 1883 سے قبل اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مظہر لغاری کے مطابق جھرک شہر کے لوگ بتاتے ہیں کہ جناح بھائی پونجا بھی وہیں پیدا ہوئے۔ کچھ بزرگوں کا کہنا ہے کہ جناح کی جائے پیدائش کا معاملہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکمرانی میں بھی اٹھا تھا اور بھٹو صاحب نے اس معاملے کے لیے ایک فیکٹ فائینڈنگ کمیٹی تشکیل دی تھی جس کے ممبران جھرک آئے اور اسکول سے ماسٹر رول اور جنرل رجسٹر سمیت تمام ریکارڈ اپنے ساتھ لے گئے جو بعد میں کبھی واپس نہیں کیا گیا۔ اس نکتے پر ہم بعد میں واپس آئیں گے۔

لیکن کچھ بزرگوں کا کہنا ہے کہ 1967 میں اس زمانے کے کمشنر حیدرآباد مسرور احسن، جو ایوب خان اور نواب آف کالاباغ کے منظورِ نظر تھے، اسکول کا ریکارڈ ساتھ لے گئے۔ اس زمانے کے ڈویژنل کمشنر کے اختیارات موجودہ دور کے گورنر سے بھی زیادہ تھے۔ مسرور احسن اردو بولنے والے تھے اور ان کے دور میں ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے اس تاثر کو تقویت دی کہ وہ

سندھیوں، سندھی زبان، کلچر اور تاریخ سے متعصبانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

ان کے دور میں 1967 میں جب سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر حسن علی عبدالرحمان نے اعتراض کیا کہ کمشنر کو یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے اجلاس میں نہیں بیٹھنا چاہیے تو کمشنر غصے میں آگئے اور انھوں نے وائس چانسلر کو ہٹانے کے اقدامات کرنے شروع کیے جس پر سندھی قوم پرست طلبا تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کو انتظامی مشینری استعمال کر کے کچلا گیا۔

ایوب خان کے دور میں تدریس کے لیے سندھی زبان پر پابندی بھی لگائی گئی، ووٹر فہرستوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر سے سندھی زبان کو مٹا دیا گیا۔ اس پس منظر میں سمجھا جاتا ہے کہ مسرور احسن نے غالباً سندھیوں کو جناح کی جائے پیدائش کے اعزاز سے محروم کرنے کے لیے ریکارڈ گم کیا۔ بقول شخصے وہ ان کی جائے پیدائش 'جھرک' تو نہیں بنا سکتے تھے، لیکن انھوں نے جناح کی جائے پیدائش وزیر مینشن تک بہر حال پہنچا دی۔

مظہر لغاری اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے اگست 1960 میں شائع ہونے والی ایک درسی کتاب کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ یہ کتاب ساتویں جماعت کے بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں سندھی زبان میں جو مضمون قائداعظم کے بارے میں لکھا گیا ہے اُس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

ساتویں کی کتاب

دوسرا مضمون (صفحہ نمبر سات)

قائداعظم محمد علی جناح

سندھ کے مایہ ناز فرزند، تقریباً پون صدی قبل جھرک کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ایک غریب بیوپاری تھے۔ کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن اُن کا شمار دنیا کی بڑی ہستیوں میں ہوگا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام سے میٹرک پاس کیا۔ بعد ازاں سیٹھ نور محمد لالن والوں سے تین ہزار روپے قرض لے کر ولایت بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے

گئے۔ وہاں کی تعلیم وتہذیب کے ان کی زندگی پر نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔

ولایت سے لوٹنے کے بعد وہ بمبئی پہنچے جہاں انھوں نے وکالت کا آغاز کیا، جس میں انھوں نے بہت نام کمایا۔

وہ وہاں کے بزرگ دادا بھائی نوروجی کے زیرِ اثر سیاسی امور میں بھرپور حصہ لینے لگے۔ پہلے پہل وہ کانگریس میں شامل ہوئے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ کانگریسی ہندو سچے نہیں، وہ مسلمانوں کی کبھی بھلائی نہیں چاہیں گے، تو انھوں نے کانگریس سے اپنے راستے الگ کر لیے اور مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور مولانا محمد علی جیسے شیر مرد بھی اُس میں شامل ہوئے، لیکن جناح صاحب اپنے اخلاق اور مستقل مزاجی کے سبب سب سے بازی لے گئے۔''

یہ تو رہے مظہر لغاری کے دلائل اور ثبوت، لیکن چونکہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے اس لیے اس معاملے کی مزید تحقیق کی ضرورت تھی۔

اسی بنا پر ہم نے نامور مورخ اور ماہرِ آثارِ قدیمہ کلیم لاشاری سے جب دوبارہ تفصیلی بات کی تو انھوں نے ایک اور انکشاف کیا۔ کلیم لاشاری کے مطابق قائدِ اعظم جھرک میں پیدا نہیں ہوئے۔ ان کے بقول قائدِ اعظم کے والد جیونا بھائی کراچی میں رہے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ کاروبار میں شریک رہے۔

جھرک جس طرح کی بستی تھی، اس سے متعلق بہت سی چیزیں ہمارے علم میں آتی ہیں۔ وہاں محلوں میں سینیٹری کمیٹیاں تھیں، چوکیداری نظام تھا۔ یہ سب شہری منظم طریقے سے اپنی مدد آپ کے تحت فعال رہتے تھے۔ تمام کاروباری دکانیں رجسٹرڈ تھیں۔ جن سے سالانہ ٹیکس وصول ہوتا تھا۔ دستاویزات میں کہیں بھی قائدِ اعظم کے والد جیونا بھائی اور دادا پونجا کا نام نظر نہیں آتا، جبکہ کراچی کے دستاویزات میں بارہا ملتا ہے۔

ان کاغذات میں تمام زمینداروں کا اندراج ہے۔ سر آغا خان صاحب بھی وہاں کے زمیندار تھے۔ ان کے نام کے سامنے لکھا ہے کہ وہ غیر حاضر زمیندار ہیں جو کراچی اور ممبئی میں رہتے ہیں۔ جھرک میں اس وقت جناح کے خاندان کی موجودگی کے حوالے سے کوئی دستاویزی ثبوت

نہیں ملتا، البتہ 1890 کے لگ بھگ جب کراچی میں طاعون پھیلا تو جناح صاحب کا خاندان پرانے شہر سے آغا خان صاحب کی جائیداد واقع موجودہ ڈیفنس میں عارضی طور پر مقیم ہوا۔

گمان یہ ہے کہ جناح کے والدین کچھ عرصے کے لیے جھرک چلے گئے ہوں، بہر حال یہ امکان بھی بہت ہی ضعیف ہے۔ اس وقت محمد علی صاحب کی عمر 16 سال کے لگ بھگ ہوگی، یعنی کہ قائداعظم محمد علی جناح جھرک میں پیدا نہیں ہوئے۔ رجسٹرڈ دستاویزات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جیونا بھائی 1872 سے 1880 تک کراچی میں ایک کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے اور ان کے والد اس مکان کی نچلی منزل پر مقیم تھے۔

یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایک شخص جو ایک شہر میں رہتا ہو اور جب بچے کی پیدائش کا وقت ہو تو وہاں سے کم سہولت والے علاقے جھرک منتقل ہو جائے؟ آخر اس عمل کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ ایک شہر سے نقل مکانی کا کوئی معقول بہانہ یا کوئی موقع محل بھی تو ہو۔ وہاں جانے کے لیے حالات اس وقت پیدا ہو سکتے تھے جب وہاں زیادہ سہولتیں اور دیکھ بھال کے واسطے نوکر چاکر ہوتے۔

جب جواب نفی میں ہو اور جب حالات یہ ثابت کرتے ہوں کہ جیونا نے کرائے کا مکان چند دنوں کے لیے بھی خالی نہیں کیا تو پھر یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ یہ گھرانا جھرک آیا ہوگا۔ یاد رہے کہ محمد علی صاحب اپنے گھر میں اکیلے بچے نہیں تھے۔ جیونا بھائی کی خاصی اولاد تھی اور وہ سب کے سب کراچی میں پیدا ہوئے۔

مظہر لغاری کے مطابق جناح صاحب کی جھرک میں پیدائش کے معاملے پر کوئی دو رائے نہیں ہیں۔ ایسے میں ایک سوال بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ جھرک کے کس اسکول سے وہ کون سا رجسٹر تھا جو غائب ہوا اور کس شخص کی گواہی سے اس رجسٹر اور اس میں موجود اندراج کا ثبوت فراہم ہوتا ہے؟

کلیم لاشاری کا کہنا ہے کہ جس کتاب کا حوالہ مظہر لغاری نے دیا ہے وہ اگست 1960 میں شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب سے قبل سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے دو اور کتابیں شایع ہوئیں جس میں قائداعظم کی جائے پیدائش کراچی لکھی گئی ہے۔ یہ تنازع کہ قائدِاعظم جھرک میں پیدا ہوئے

تھے یا وزیر مینشن میں اپنی جگہ لیکن کلیم لاشاری کا مؤقف بہت دلچسپ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قائدِ اعظم کی جائے پیدائش نا تو وزیر مینشن ہے اور نا ہی جھرک۔

کلیم لاشاری کے بقول:

ہوا یوں تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح نے تقسیم ہند کے بعد کراچی کے ایک کمشنر کو یہ بتایا تھا کہ وزیر مینشن ہمارا مکان تھا۔ وہ اس گھر میں پیدا ہوئی تھیں اور ان کا بچپن اس میں گزرا تھا۔ تو لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی یا مزید تحقیق نہیں کی کہ جناح صاحب بھی اسی مکان میں پیدا ہوئے تھے یا نہیں۔

انھوں نے سوچا ہوگا کہ اگر محترمہ فاطمہ جناح اس گھر میں پیدا ہوئی ہیں تو یقیناً جناح صاحب بھی یہیں پیدا ہوئے ہوں گے۔ جناح صاحب نے خود یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ کراچی میں پیدا ہوئے ہیں تو لوگوں نے اس مفروضے پر یقین کرلیا اور اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

کلیم لاشاری کے مطابق:

وزیر مینشن جس زمین پر واقع ہے، اس کا پلاٹ نمبر 14 ہے جو 1880 تک خالی تھا۔ اس زمین پر دو وکھار (آوٹ ہاؤسز) واقع تھے اور ایک دو منزلہ مکان تھا۔ اس کے برابر والی زمین پر بھی ایک چھوٹا دو منزلہ مکان اور دو وکھار بنے ہوئے تھے۔ یہ دونوں پلاٹ دراصل مختلف مواقع پر عمر نامی شخص نے میونسپلٹی سے نیلام میں خریدے تھے۔

پلاٹ کی وہ سمت جس پر وزیر مینشن بنا ہوا ہے، اس پر موجود مکان میں مالک خود رہتا تھا، جبکہ دوسری سمت میں جو دو منزلہ مکان تھا اس میں جیونا اور پونجا دونوں کرائے پر رہتے تھے۔ اس جگہ آج کل علی منزل نامی اپارٹمنٹ موجود ہے۔

وزیر مینشن نامی عمارت دراصل 1880 کے قریب تعمیر ہوئی اور اس زمانے میں دونوں پلاٹ جیونا بھائی کی ملکیت تھے۔ محمد علی جناح صاحب کی پیدائش کا سن 1876 سرکاری طور پر مانا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے 1875 بھی مانتے ہیں۔

لاشاری صاحب اس معاملے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

محمد علی جناح صاحب کی پیدائش ہوئی تو وزیر مینشن تعمیر ہی نہیں ہوا تھا۔ پلاٹ نمبر 14 کا رقبہ خاصا بڑا تھا اس پر تین پلاٹ تھے اور 1874 کے سروے کے مطابق ان کو ملا کر ایک نمبر الاٹ کیا گیا تھا۔ اس پلاٹ کا ایک ٹکڑا عمر نے کراچی میونسپلٹی سے حاصل کیا تھا۔

1866 میں عمر نے عبدالرحیم چھاگلہ سے 2500 روپے قرض لیا تھا، جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی یہ جائیداد، جس میں 3 قطعہ زمین شامل تھے اور اُس وقت ان کے تین الگ الگ نمبر تھے، ایک میونسپل نمبر تھا، دوسرا ٹاؤن نمبر تھا، اور ایک وہ جو انھوں نے نیلامی میں خریدا تھا، یہ تینوں پلاٹ عمر نے عبدالرحیم چھاگلہ کے پاس گروی رکھ دیے۔

سال بھر بعد عمر نے مزید کچھ رقم چھاگلہ صاحب سے ادھار لی تو عبدالرحیم کی نظر میں قرضے کی رقم کے مقابلے میں یہ جائیداد چھوٹی تھی۔ تو ڈوسا ہیر جی کا ایک اور گودام جو ٹرانس لیاری کوارٹر میں تھا، وہ بھی اس میں شامل کیا گیا۔ کچھ برس بعد عمر رقم ادا نہ کرسکے تو انھوں نے اپنی ملکیت بیچ کر معاملہ صاف کیا، یہ تمام دستاویزات رجسٹرار کے دفتر میں موجود ہیں۔

جس شخص نے یہ جگہ خریدی، اس نے یہ جائیداد جیونا بھائی ناتھا بھائی اینڈ کمپنی کے پاس گروی رکھ دیں۔ جیونا بھائی قائداعظم محمد علی جناح کے والد تھے، ان کے دو اور بھائی بھی تھے جو کراچی میں کاروبار کرتے تھے، وہ شخص بھی رقم ادا نہ کرسکا اور یہ جائیداد جیونا بھائی کے ہاتھوں فروخت کردی گئی۔

1870 کی دہائی کے دوران پلاٹ نمبر 14 پر تعمیرات کی تفصیل کے مطابق پونجا بھائی اور جیونا بھائی درمیان والی عمارت میں کرائے پر مقیم تھے۔ نونہم روڈ والا حصہ عمر پڑ پیا اور بعد میں ڈوسا ہیر جی کی ملکیت میں رہا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں 1883 کے بعد نئی عمارت تعمیر کی گئی۔ پلاٹ نمبر 14 کو بعد میں نمبر 23 الاٹ کرکے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا جو آج تک موجود ہے — نقشہ کاپی رائٹ کلیم اللہ لاشاری۔

1880 میں جیونا بھائی اور ان کے بھائیوں نے اس جگہ پر مکان کی تعمیر کا آغاز کیا۔ 1880 سے 1886 کے دوران جیونا بھائی کی جائیداد کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا۔ اب یہ ہوا کہ جو ناتھا بھائی اور جیونا بھائی کی کمپنی تھی، جس نے اس جگہ یہ خوب صورت عمارت تعمیر کی تھی، کسی وجہ سے جیونا بھائی جو اس وقت تک جناح کہلائے جانے لگے، اب ان کی کمپنی کو خسارہ ہوا اور یہ تمام جائیداد نیلام کرنی پڑی، اور اس کی قیمت 18,500 روپے لگائی گئی۔ یہ 1890 کی بات ہے۔

انہی دستاویزات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاں اس وقت وزیر مینشن ہے، اس کے ساتھ ایک اور چھ منزلہ عمارت 'علی پلازہ' موجود ہے لیکن اس وقت اس جگہ ایک چھوٹا سا گھر ہوتا تھا، جس کے گراؤنڈ فلور پر محمد علی کے دادا پونجا رہتے تھے اور پہلے فلور پر جیونا بھائی رہتے تھے۔

یہ لگ بھگ وہی عرصہ ہے، جس عرصے میں جناح صاحب پیدا ہوئے تھے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جناح صاحب نا جھرک اور نا ہی وزیر مینشن، بلکہ اس جگہ پیدا ہوئے جو آج کل علی پلازہ کہلاتی ہے۔

جناح بھائی کا نام جیونا سے جینا بنا اور بعد میں اس سے بھائی خارج ہوا تو جناح میں تبدیل ہوا۔ یہ تبدیلی 1866 سے لے کر 1880 کے دوران عمل میں آئی۔ سرکاری دستاویزات میں یہ تبدیلی ان کے دستخطوں سے واضح صورت میں نظر آتی ہے۔ بہرحال فاطمہ جناح کے کہنے پر کارروائی کرتے ہوئے کمشنر کراچی نے وہ مکان قبضۂ سرکار میں لے لیا اور مکان مالک وزیر علی علاؤالدین صاحب کو متبادل کے طور پر ایک اور جگہ دے دی گئی۔ لاشاری صاحب نے جس تسلسل سے ہونے والے واقعات گنوائے ہیں اس سے تو سارا معاملہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ہم نے وزیر مینشن کا خود جا کر جائزہ لیا، وہاں پر جناح صاحب کے زیرِ استعمال رہنے والی مختلف چیزیں بھی موجود ہیں۔ اس عمارت کو ''قائدِ اعظم برتھ پلیس'' بھی کہا جاتا ہے، اور اسی حیثیت سے سرکار نے اس عمارت کو قومی ورثہ قرار دیا ہے جو کہ مناسب نہیں۔

اس عمارت کی حکومتی پہچان حقیقت سے قطعی بعید ہے، کیونکہ وہاں ایک کمرے میں یہ تختی آویزاں ہے کہ ''محمد علی جناح اس کمرے میں پیدا ہوئے۔''

اس میں شک نہیں کہ یہ عمارت جناح خاندان کے زیر استعمال رہی اور اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ اسی خاندان نے یہ عمارت تعمیر کی ہو، لیکن وہ عمارت جو تعمیر ہی 1880 کے بعد ہوئی ہو اس کو قائدِ اعظم کی جائے پیدائش کہنا تاریخی طور پر کیسے درست ہو سکتا ہے؟

❁

گوردھن داس کا حُقہ پانی بند کیوں ہوا؟

گوردھن داس کے حُقہ پانی بند ہونے سے مُراد اُن کا سماجی بائیکاٹ ہے۔ گوردھن کا تعلق ہندوؤں کی کھتری برادری سے ہے۔ اُن کے بائیکاٹ کا فیصلہ نا صرف اُن کی اپنی برادری نے کیا ہے بلکہ میرپورخاص کی ہندو پنچایت نے بھی کر دیا ہے۔

اس بائیکاٹ کے سبب وہ اور ان کے اہلِ خانہ ہندو برادری کی مذہبی رسُومات، شادی و غمی کی تقریبات میں شامل نہیں ہو سکیں گے اور ان کے قریبی رشتے دار بھی اُن سے میل جول بند کر دیں گے۔ سادہ سی بات ہے کہ انھیں اپنی ساری زندگی سماجی تنہائی میں بسر کرنی پڑے گی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر گوردھن داس کا قصور کیا ہے؟ اس سے قبل کہ ہم آپ کو ان کا قصور بتائیں، آیئے مشہور کمیونسٹ رہنما سجاد ظہیر کی بیٹی نور ظہیر کی کتاب ''میرے حصے کی روشنائی'' کا کچھ حصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

بائیں بازو کی سیاست سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو سجاد ظہیر کے بارے میں مکمل آگاہی ہوگی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی ہدایت پر پاکستان کمیونسٹ تحریک کو مضبوط کرنے آئے تھے لیکن پاکستان میں دس سال جیلوں میں گزارنے کے بعد دوبارہ انڈیا منتقل ہو گئے۔ اُن کی بیٹی نور ظہیر اپنی کتاب ''میرے حصے کی روشنائی'' میں لکھتی ہیں کہ:

> مجھے گلابی جاڑے کی وہ صبح ابھی تک یاد ہے جب دودھ والے کی دستک سمجھ کر کھولے گئے دروازے سے فریدہ امی کے اوپر ڈھے پڑی تھی۔ امی نے چیخ مار کر اسے سنبھالا اور اندر لا کر بٹھایا۔ وہ چار گھنٹے اندھیری رات میں پیدل چل کر دہلی یونیورسٹی سے حوض خاص آئی تھی۔

فریدہ ایک اچھے مسلمان گھر کی لڑکی، پڑھنے لکھنے میں ذہین، دیکھنے میں خوب صورت اور دل سے بھی۔ اب دل کی کیا پوچھیے، سب کیا دھرا اسی کمبخت دل کا ہے۔ اس کا دل ایک بنگالی ہندو برہمن کا ہو گیا تھا۔

امی کے بار بار اصرار کرنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس ابا سے ملنے کی ضد کرتی رہی۔ ابا کانپور گئے ہوئے تھے اور اسی دن لوٹنے والے تھے۔ فریدہ ابا سے صرف دو بار ملی تھی۔ جب اُس کے ماں باپ کو اُس کے ارادوں کا پتا چلا، اسے مار پیٹ کر ایک کمرے میں بند کر دیا، تو اُس کے دل میں بس ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح اگر سجاد ظہیر تک پہنچ جائے۔ امی نے اس سے بار بار پوچھا، 'تم چاہتی کیا ہو؟' کیا کریں سجاد ظہیر؟

معلوم نہیں، مگر وہ ضرور میری مشکل کا حل نکال پائیں گے۔

ابا کے آنے کے بعد دونوں طرف کے لوگوں کو اطلاع دے کر جمع کیا گیا۔ سب باتیں سننے کے بعد ابا نے بس تین سوال پوچھے۔ 'لڑکی پڑھی لکھی اور نوکری پیشہ ہے؟'، 'کیا وہ لڑکی کا مذہب بدلوانا یا اپنا بدلنا چاہتا ہے؟ یعنی زندگی میں آئی پہلی بڑی کشمکش کا سب سے آسان راستہ تو نہیں چننا چاہتا؟' اور کیا لڑکی لڑکا فوراً شادی کرنا چاہتے ہیں؟

جب تینوں باتوں پر ہامی بھری گئی تو ابا نے بڑے اطمینان سے سگریٹ ہونٹوں سے لگا کر کہا کہ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم لوگ اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں۔"

شادی کی تاریخ اسی دن طے ہو گئی۔ فریدہ کے والدین کو منا تو لیا گیا، مگر وہ اس رشتے سے خوش نہیں تھے۔ چلتے چلتے فریدہ کے بڑے ابا نے کہا، ظہیر صاحب! دوسروں کی لڑکیوں کے لیے ترقی پسند ہونا آسان ہے۔ اگر کہیں آپ پر آن پڑی تب پوچھیں گے۔

اس واقعے کے کوئی دو برس بعد نسیم (نور ظہیر کی بہن) نے ڈرتے ڈرتے اپنے دل کی بات عام کی۔ ابا کے وہی تین سوال تھے۔ جواب ہاں میں ملا اور 19 فروری 1969 کو نسیم اور ونود بھاٹیہ

کی شادی ہوگئی۔

1992 میں جب انڈیا میں بابری مسجد کے انہدام کی کوشش کی گئی تو پورے پاکستان میں سخت ردِعمل ظاہر ہوا۔ بابری مسجد کے ردِعمل میں میرپورخاص شہر میں بھی ہنگامے پھوٹ پڑے اور بہت سے مندر مسمار کر دیے گئے۔ دو مندروں کے انہدام کا میں خود عینی شاہد ہوں، جو کہ غریب آباد روڈ پر واقع تھے۔

میرپورخاص کی معروف ماہر امراضِ زچہ و بچہ، ڈاکٹر موہنی کے ہیر آباد (اس علاقے کا نام ہیر آباد، ہندوؤں نے رکھا تھا، پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانوں نے اس کا نام عزیز آباد کر دیا۔ لیکن برسوں گزر جانے کے بعد بھی ہیر آباد عزیز آباد نہ بن سکا) میں واقع گھر پر حملہ کیا گیا اور ان کا مال و اسباب لُوٹ لیا گیا۔

اس سے قبل کہ لوٹ مار کا یہ سلسلہ اور آگے بڑھتا، اُس وقت حُروں کے روحانی پیشوا سید شاہ مردان شاہ دوئم (پیر صاحب پگارا) کے مسلح حُروں نے پیر صاحب کے مرید حاجی غلام رسول جونیجو کی ہدایت پر ہندوؤں کے گھروں کے باہر پہرے داری شروع کر دی۔ حروں کی آمد کے بعد لُوٹ مار کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

یہ ہندو مسلم دوستی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ماضی میں بھی میرپورخاص ڈویژن کے علاقوں میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے حقوق کی نا صرف مکمل پاس داری کی بلکہ اُس کا تحفظ بھی کیا۔ یہاں بسنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوستانہ تعلقات صدیوں سے استوار رہے ہیں اور ان تعلقات کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی رضامندی سے شادیاں بھی ہوئی ہیں۔

اسی بارے میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سیاسی تجزیہ نگار اور مؤرخ محمد موسیٰ بھٹو اپنی کتاب 'سندھ کے حالات کی سچی تصویر' کی اشاعت سوئم، مطبوعہ اپریل 1986 کے صفحہ نمبر 7، 8، 9 اور 10 پر سندھ کے مشہور مصنف اور تاریخ دان مرزا قلیچ بیگ کی کتاب 'قدیم سندھ' کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑو نے 'کچھ' کے حکمران مہاراجہ کی بھتیجی سے شادی کی۔''

(حوالہ: قدیم سندھ، صفحہ نمبر 367)۔

اسی طرح سندھ کے نام ور محقق رحیم داد بروہی مولائی شیدائی اپنی کتاب ''تاریخ تمدن سندھ'' میں لکھتے ہیں کہ:

کلہوڑوں اور میروں نے ہندوؤں کے ہاں سے شادیاں کی اور ان کے عوض ان پر آبیانہ وغیرہ معاف کیا گیا۔

مؤرخ ومصنف نارائن چند اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

کلہوڑوں اور میروں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں نے لالچ اور خوف کی بنا پر مسلمانوں کو اپنی لڑکیاں دیں۔ انھوں نے مسلمانوں میں سے اکثر کھوسوں (بلوچوں کی ایک ذات) اور کلہوڑوں کو رشتے دیے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں، مثلاً میر غلام علی خان، میر سہراب خان اور کھوسوں کے سردار داور کو ہندوؤں نے اپنی لڑکیاں دیں۔

''ضلع تھر پارکر میں 'جمکی' بازار ہے۔ وہاں مسلمانوں کی ایک قوم 'راہماں (راہموں) ارباب' رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہندو عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں۔ اسی طرح تحصیل ڈیپلو میں 'ترائی' نام سے ایک گوٹھ ہے وہاں 'نہڑی ارباب' بستے ہیں۔ وہ بھی ہندوؤں سے رشتے لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ کے کچھ سید اور بھرگڑی خاندان کے افراد نے تھر کی ہندو لڑکیوں سے شادیاں کیں۔'' (تاریخ ریگستان از نارائن چند، صفحہ 129۔ طابع، سندھی ادبی بورڈ)۔

ایک اور حوالہ ملاحظہ ہو:

مغلوں نے اپنے دورِ حکومت میں تھر پارکر کے ہندو ٹھاکروں کے راج کو ختم کر دیا تھا اور ان کو حکمرانی کے جو حقوق حاصل تھے، وہ ان سے چھین لیے تھے، لیکن مغلوں کے بعد جب میروں کی حکومت آئی تو ہندو ٹھاکروں نے میروں سے راہ و رسم بڑھائے، ان کے سرداروں اور امیروں کو اپنی لڑکیاں دیں۔ یہ راہ و رسم اس قدر بڑھی کہ اس زمانے میں چاچڑوں کی ٹھاکروں کے ایک مسلح گروہ سے لڑائی ہوئی تو

اس لڑائی میں ہندو ٹھاکروں کی مدد کے لیے تالپی کے بلوچ سرداروں عالم خان اور نجی خان نے پانچ سو گھڑ سوار افراد بھیجے۔ ہندو ٹھاکروں نے اسی بنا پر مسلمان سرداروں کو اپنی لڑکیاں دیں اور ان کو راؤ تسر اور ہیرار نامی دو قصبے بطور جہیز دیے۔

ایک اور تاریخ دان نارائن داس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

میروں کے دورِ حکومت میں شکار پور میں ہندوؤں کی نو سو تجارتی کوٹھیاں تھیں۔

(میرانِ سندھ، صفحہ 193)۔

اسی طرح نارائن چندا اپنی کتاب تاریخِ ریگستان میں مزید لکھتے ہیں کہ:

میروں نے نئے کوٹ، مٹھی اور اسلام کوٹ کے حفاظتی قلعے اُن ہندوؤں کے سپرد کر دیے جو ان کے وفادار تھے۔ ان میں سے ہر ایک قلعے میں بارہ سپاہی تھے۔ ایک ایک قلعے کی عمارت پر آٹھ آٹھ لاکھ روپے کی لاگت آتی تھی۔

(تاریخِ ریگستان، صفحہ 188)۔

اب آیئے ایک بار پھر گوردھن داس کے بارے میں آپ کو بتاتے ہیں۔

گوردھن داس ایک کامیاب ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ میر پور خاص میں ان کا ہومیو پیتھک کلینک خاصا مشہور ہے جس کے ساتھ ہی ان کا ذاتی ہومیو پیتھک دواؤں کا اسٹور بھی ہے۔

گوردھن داس کے دو بچے، ایک بیٹا اور دوسری بیٹی ہے۔ بیٹے کا نام 'پون' جبکہ بیٹی کا نام 'منیشا' ہے۔ گوردھن داس کا تعلق جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ ہندوؤں کی ذات کھتری سے ہے۔

ضلع میر پور خاص ماضی میں سندھ کے چار اضلاع پر مشتمل تھا۔ ضلع سانگھڑ کی تحصیل کھپرو کے قصبے ہتھنگو، جو کہ کھپرو سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں لیکن 98 فیصد آبادی کا تعلق مسلمانوں کی قائم خانی برادری سے ہے۔ مگر ڈاکٹر گوردھن داس کا حقہ پانی (سماجی بائیکاٹ) بند کیوں ہوا؟ اس سلسلے میں روزنامہ سندھ ایکسپریس کے سانگھڑ میں نمائندے محمد علی بلوچ نے اگست 2016 میں اپنے ایک مضمون میں انکشاف کیا ہے کہ:

ڈاکٹر گوردھن داس کھتری نے اپنی 16 سالہ بیٹی منیشا کماری کی ضد کے آگے ہتھیار

ڈال دیے۔ انھوں نے اس بات کا بھی کوئی خیال نہیں کیا کہ اُن کی کھتری برادری کے عمائدین اور ہندو پنچایت اُن کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ انھوں نے منیشا کی شادی ایک مسلمان نوجوان سے کروادی۔

منیشا کھتری 'گھنگو کے ایک مسلمان نوجوان 'بلال یوسف قائم خانی' سے محبت کر بیٹھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی محبت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر منیشا نے اپنے والد ڈاکٹر گوردھن کھتری سے بتا دیا کہ بلال ہی میرا جیون ساتھی بنے گا، بصورت دیگر وہ موت قبول کرے گی۔

منیشا کے والد نے اپنی بیٹی کی ضد سے مجبور ہو کر سماج و برادری، حتیٰ کہ مذہب کو بھی بالائے طاق رکھ کر ہندو مسلم دوستی کی ایک نئی رسم کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو مسلمان کروا کے قائم خانی برادری کے نوجوان بلال یوسف کے ساتھ اُس کی شادی کروادی۔

اس بات پر جہاں مسلمان برادری میں خوشیاں منائی گئیں تو وہیں ہندو برادری نے اس واقعے کا 'سخت نوٹس' لیتے ہوئے ڈاکٹر گوردھن داس کو اپنی برادری سے خارج قرار دیا ہے۔

سندھی روزنامہ کاوش کے مطابق ہندو پنچایت نے بیٹی کو مسلمان کروا کر اس کی شادی کروانے والے ڈاکٹر گوردھن کھتری کا سماجی بائیکاٹ کر دیا ہے، جبکہ دلت ہندو پنچایت اور بھیل برادری نے بائیکاٹ کی مخالفت کی ہے اور ڈاکٹر گوردھن کی حمایت کی ہے۔

یہ نہایت دلچسپ صورتحال ہے۔ ہم اس سے پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح ہندوؤں کی نچلی ذاتوں میں شادی کے لیے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کرنے کا رجحان عام ہے، اور بسا اوقات ذات پات کی ناہمواری کی وجہ سے شادی ممکن نہ ہو تو مذہب کی تبدیلی کا سہارا لیا جاتا ہے۔

خاندان کے سماجی بائیکاٹ کے اعلان کے بعد منیشا کے والد ڈاکٹر گوردھن داس کھتری نے کاوش سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اُن کا سماجی بائیکاٹ کرنے کے لیے اگر کوئی جرگہ ہوا ہے تو یہ ناانصافی ہے۔ اُن کے مطابق شادی کے لیے وہ اور دولہا کے رشتے دار رضامند تھے، اس لیے برادری کو اس کا افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر گوردھن داس کے مطابق انھوں نے صرف اپنی بیٹی

کی شادی کی ہے، دوسروں کی بیٹیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر گوردھن داس کی برادری ان کا یہ مؤقف ماننے کو تیار نہیں، اور اس بات پر مصر ہے کہ انھوں نے ہندو برادری کی لڑکیوں کو ایک نیا راستہ دکھادیا ہے۔

چنانچہ کھتری پنچایت کے مُکھی (رہنما) ڈاکٹر جھامن داس کے مطابق برادری کے لوگوں نے اپنے طور پر سماجی بائیکاٹ کیا ہے، لیکن ابھی برادری کے اہم افراد اس معاملے پر مزید تفصیلی بات کریں گے، جس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا مگر برادری اس فیصلے پر سخت ناراض ہے۔ دوسری جانب ہندو پنچایت میر پور خاص کے صدر اور سابق ایم پی اے پھمن داس پاروانی نے کہا ہے کہ ڈاکٹر گوردھن کو ایسا فیصلہ کرنا تھا تو پہلے پنچایت سے پوچھتے۔ ہم بھی ہندو پنچایت کی جانب سے ان کا سماجی بائیکاٹ کرتے ہیں۔

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پورے معاملے میں مسلمانوں کے علاوہ جو گروہ ڈاکٹر گوردھن داس کا ہم آواز ہے، وہ نچلی ذات کے ہندو ہیں، جنھوں نے ان پر لگنے والی سماجی پابندیوں کی سخت مخالفت کی ہے۔

دلت ہندو پنچایت کے رہنما ایڈووکیٹ کانجی رانو نے روزنامہ کاوش سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر گوردھن اور ان کے خاندان کا سماجی بائیکاٹ ناانصافی ہے۔ ان کے مطابق اگر کوئی جبری مذہب تبدیل کرواتا تو دوسری بات تھی، پر اگر اس معاملے میں لڑکی اور اس کے اہل خانہ راضی ہیں تو اُس کی مخالفت نہیں ہونی چاہیے۔

بہر حال ڈاکٹر گوردھن داس کے ساتھ جو ہوا، اس سے قطع نظر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس کام کے لیے بہت زیادہ ہمت درکار تھی۔ اور اثر و رسوخ نہ رکھنے والا ایک عام شخص اتنا دلیرانہ اقدام کر گزرے، یہ بات اتنی آسان نہیں ہے اور سندھ کی بین المذاہب بھائی چارے پر مبنی تاریخ کو مدِ نظر رکھیں، تو بڑھتے ہوئے نفرت انگیز واقعات کے درمیان محبت کی یہ داستان ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

❁

محبت کی شادی کا مذہبی فارمولا

جبری مذہب تبدیل کروانے کا مسئلہ سندھ میں غیر مسلموں، خصوصاً ہندو اکابرین اور تنظیموں کی جانب سے اکثر اٹھایا جاتا ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جب کسی امیر ہندو گھرانے کی لڑکی مسلمان ہو جائے تو اونچی ذات کے ہندو اس پر بہت سخت احتجاج کرتے ہیں جبکہ اگر مسئلہ کسی دلت برادری (جنھیں اچھوت ہریجن اور شیڈول کاسٹ کہا جاتا ہے، ان میں تین بڑی برادریاں کولہی، بھیل، میگھواڑ شامل ہیں) کی لڑکی کا ہو تو یہ آواز دھیمی ہوتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اکثر چھوٹی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ایسے معاملات پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔

سینئر صحافی امر گرڑو جو اقلیتی برادری کے مسائل پر رپورٹنگ کے لیے شہرت رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دلت یا چھوٹی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کے مسائل کی تشہیر اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اس کے لیے میڈیا اور عدالتوں میں مہم چلانی پڑتی ہے جس میں بہت سارا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

دلتوں کے پاس پیسہ تو خیر ہے ہی نہیں لیکن پاکستان کی قومی اسمبلی، سینیٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں بھی ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس وقت ان تمام اداروں میں اقلیتوں کی مخصوص 32 نشستیں ہیں، جن میں سے 19 ہندو ہیں۔ ان 19 میں سے 17 کا تعلق اونچی ذات کے ہندوؤں سے ہے اور اچھوتوں کے صرف دو نمائندے ہیں جن میں سے ایک ڈاکٹر کھٹومل جیون اور دوسرے گیان چند ہیں۔ دونوں کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان میں آباد ہندوؤں کا 80 فیصد طبقہ دلت یا چھوٹی ذات

کے ہندوؤں پر مشتمل ہے، اس لیے جب بھی کسی اعلیٰ ذات کی لڑکی مذہب تبدیل کرتی ہے تو قومی و صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ میں اس معاملے پر آواز اٹھانے کے لیے 17 اراکین ہوتے ہیں جبکہ اچھوتوں کے نہ ہونے کے برابر۔ اقلیتوں کے مسائل اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جب ہندوؤں کے نمائندوں کے انتخاب کو ووٹ سے مشروط کیا جائے .وگرنہ مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب سے اقلیتوں کی مخصوص نشستوں پر مال دار ہندو سیٹھ منتخب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

صحافی محسن سوہرو کے مطابق ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ہندومت سے دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی اکثریت لڑکیوں کی ہوتی ہے، جو اسلام قبول کرتی ہیں۔ ان کی اپنے علاقے کے کسی مسلمان لڑکے سے فوراً شادی بھی ہو جاتی ہے اور پھر معاملہ عدالت تک پہنچ جاتا ہے اور 99 فی صد واقعات میں لڑکی اپنے شوہر کے حق میں بیان دے کر سسرال چلی جاتی ہے۔ صرف ایک کیس ایسا ہے جس میں بھری عدالت میں لڑکی نے اسلام اور شادی سے انکار کیا اور اُس کا تعلق کراچی کے علاقے لیاری سے تھا۔

سینئر صحافی اور کرائم رپورٹر قادر لاشاری کے مطابق جو لوگ پسند کی شادی کرتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں ان کا سب سے بڑا مسئلہ تحفظ کا ہوتا ہے۔ تاہم وہ اپنے تحفظ کے لیے بااثر افراد اور انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جو بھی ہندو خواتین پسند کی شادی کرتی ہیں وہ تحفظ کے لیے بااثر مذہبی پیشواؤں کی پناہ لیتی ہیں۔ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے اس پر ایک گہری تحقیق درکار ہے۔

30 جولائی کو اتوار کا دن تھا۔ اس دن کراچی بھر کے تمام کتاب گزیدہ صبح سویرے ریگل چوک پہنچ جاتے ہیں ان میں صحافیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ معدودے چند کے جن مین الطاف، مجاہد اور اسلم سولنگی نمایاں ہیں۔

اسلم سولنگی ایک مزے دار شخصیت کے مالک ہیں۔ گلستان جوہر سے ریگل تک کے طویل سفر طے کرنے کے دوران ہم پریس کلب پر وقفہ کرتے ہیں۔ کچھ دیر اپنے اوسان بحال کرنے اور

ٹھنڈا پانی پینے کے بعد ریگل روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کہانی لکھنے کا خیال مجھے کیوں آیا؟ دراصل اس اتوار کو ہم ریگل جانے کے لیے پریس کلب کے گیٹ پر پہنچے ہی تھے کہ اسلم سولنگی نے ہمیں روک کر ایک نوجوان لڑکے اور برقعہ پوش لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ہم سمجھ گئے کہ یہ پسند کی شادی کا معاملہ ہے۔ ایسے معاملات میں لڑکا لڑکی کو سندھی اخبارات ''پریمی جوڑو'' لکھتے ہیں۔ خبر مخصوص ہوتی ہے جو غالباً کراچی میں کوئی ایک ہی شخص لکھتا ہے۔ حاصل خبر یہ ہوتا ہے کہ لڑکے لڑکی نے پسند کی شادی کی ہے۔ اب انھیں خطرہ ہے کہ انھیں ''کاروکاری'' قرار دے کر جان سے مار دیا جائے گا۔ میں آگے بڑھنے لگا تو اسلم نے کہا کہ اختر بھائی ان سے آپ بات کرلیں، آپ تو انسانی حقوق کے رکن بھی ہیں۔ میں مجبوراً رُک گیا۔ جوڑے کو لے کر ہم کلب کے ٹیرس پر پہنچے۔ نوجوان نے اپنی کہانی سُنائی جو کہ کچھ یوں تھی:

نوجوان لڑکے کا نام کرشن اور والد کا نام وسند ہے جو کنری کا رہائشی اور ذات کا بھیل ہے۔ اس کے گاؤں میں رانی کولہی بنت روپو کولہی اپنے ماموں کے پاس قیام پذیر تھی۔ کولہیوں کے گاؤں کا نام گوٹھ شگن کولہی ہے جو ضلع عمرکوٹ کی تحصیل کنری میں واقع ہے۔ اس گاؤں کی زندگی بھی سندھ کے دیگر گاؤں کی طرح ہے۔ خاندان کے خاندان خصوصاً چھوٹی ذات کے ہندو خاندان زراعت کے شعبے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مردوں کی بجائے خواتین پر کام کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے۔ خواتین کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ کھانا پکانا، بچے پیدا کرنا اور انھیں پالنا، ان کی ذمے داریوں میں شامل ہوتا ہے۔

غیر شادی شدہ خواتین اپنی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ رانی، جس کا تعلق ویسے تو میرپور خاص شہر سے متصل رتن آباد کے علاقے میں واقع گاؤں گوٹھ شمس الحق چوہدری سے تھا، وہ اکثر اپنے ماموں کے گھر رہتی تھی۔ کھیتوں میں آنا جانا اور وہاں کام کرنا روز کا معمول تھا۔ کرشن بھی کھیتوں کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس دوران رانی کولہی اور کرشن بھیل کی آنکھیں چار ہوئیں، کبھی کبھار موقع پا کر دونوں بات چیت بھی کر لیتے تھے۔ دونوں میں کچھ عہد و پیماں بھی ہوئے۔ کرشن اپنے گھر والوں سے بات کرتا تو بڑا مسئلہ ہوتا۔ رانی تو عورت تھی اس لیے یہ ممکن ہی

نہ تھا کیونکہ اُس کا تعلق کولہی قبیلے سے تھا اور وہ کسی بھیل کرشن کے بارے میں اظہار پسندیدگی نہیں کرسکتی تھی، کیونکہ بھیل ذات کولہیوں سے اوپر سمجھی جاتی ہے۔

کرشن نے اپنے کاکا (چچا) خمیسو سے موبائل فون پر اس بارے میں بات کی۔ خمیسو کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ کرشن سمیت کسی کو بھی اُس کا کراچی کا پتا معلوم نہ تھا۔ لیکن وہ جب کراچی سے کنری آتے تو خاندان والوں کے لیے ڈھیر سارے تحفے تحائف ضرور لاتے تھے۔ کرشن نے خمیسو کو اپنے عشق کے بارے میں بتایا۔ خمیسو نے کرشن کو ہدایت کی کہ وہ اگر رانی کو لے کر میر پور خاص پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو ان کی شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ 28 جولائی کو کرشن اور رانی کے لیے اہم دن تھا۔ وہ رات بھر سو نہیں پائے۔ صبح سویرے رانی کھیتوں میں کام کرنے کے بہانے گھر سے نکلی۔ ابھی ماموں اور ممانی اور دیگر اہل خانہ سو رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی رانی دروازے پر پہنچی تو ممانی نے چادر سے منہ نکال کر کہا "اے چری کتھ جائیں؟" (باؤلی کہاں چلی)۔ رانی نے کہا کھیتوں میں کام کرنے۔ ممانی دوبارہ چادر اوڑھ کر سو گئی۔ رانی جیسے ہی گھر سے باہر نکلی تو تھوڑی دور ہی کرشن اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ رانی سندھ کی روایتی چادر اجرک میں لپٹی کرشن کے ساتھ چل پڑی۔ کنری سے میر پور خاص کا سفر اتنا آسان نہ تھا۔ دونوں چنگ چی رکشے پر سوار ہو کر میر پور خاص اسٹاپ پر پہنچے جو شہر سے تقریباً 5 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں ایک گاڑی ان کے انتظار میں تھی۔ کرشن کے بہ قول گاڑی والے نے اپنا تعارف صحافی کی حیثیت سے کروایا اور کہا 1500 روپے دے دو۔ پیسے لے کر گاڑی والے نے انھیں حیدر آباد ٹول پلازہ پر پہنچایا۔ ہم نے کرشن سے صحافی کا نام پوچھا مگر وہ چپ رہا۔ منظور تھا پر داتیرا۔ کرشن کا کہنا تھا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ایک سے دو گھنٹے کے دوران وہ کراچی ہوں گے، لیکن بُرا ہو نواز شریف کا اور بھلا بھی جو سپر ہائی وے کو موٹر وے بنا رہے ہیں، اُن کے ان ترقیاتی کاموں کی وجہ سے حیدر آباد اور کراچی کے درمیان جو سفر ایک سے دو گھنٹے میں طے ہوتا ہے، اب پانچ سے 6 گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔

کرشن اور رانی سہراب گوٹھ پر بس سے اُترے۔ کرشن نے خمیسو کو فون کیا تو اس نے انھیں بتایا کہ ٹیکسی میں بیٹھو اور ڈرائیور کو بتاؤ کہ شیر شاہ کے قریب سائٹ کے علاقے میں حبیب بینک

چورنگی جانا ہے۔ جب وہاں پہنچ جاؤ تو کسی سے بھی کہنا کہ بنوریہ ٹاؤن مدرسے جانا ہے۔ میں مدرسے کے باہر ملوں گا۔ کرشن نے ایسا ہی کیا اور آخر کار وہ رانی سمیت مدرسے پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی ٹیکسی رُکی تو کرشن کی نظر کھیمسو پر پڑی۔ وہ ٹیکسی سے اُترے تو کھیمسو نے کرشن کو کہا کہ بیٹا دیکھو، تو یہاں آ گیا، رانی کو لے کر، بڑی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے کرشن کے ہاتھ میں سو، سو کے نوٹوں کی بڑی گڈی تھماتے ہوئے کہا کہ یہ 20 ہزار ہیں۔ دھیان سے خرچ کرنا اور ہاں، آج کے بعد تم اور رانی مسلمان ہو جاؤ گے، میں ہندو ہی رہوں گا۔ آج سے میرا تمھارا کوئی لینا دینا نہیں۔ کرشن نے بتایا کہ کھیمسو اس کے بعد واپس چلے گئے۔ ہم نے مدرسے کے دروازے پر دستک دی۔ چوکیدار نے دروازہ کھول کر پوچھا کیوں آئے ہو؟ میں نے کہا مسلمان ہونا ہے۔ وہ مجھے اندر لے گئے اور پھر ہم مسلمان ہو گئے۔

ان کے مسلمان ہونے کی خبر 29 جولائی 2016 کے روزنامہ ''خبریں'' اخبار کے کراچی ایڈیشن کے سٹی نیوز کے صفحہ نمبر 2 پر چھپی ہے۔ ہم پوری خبر من وعن ذیل میں دے رہے ہیں۔ (روزنامہ خبریں کا کراچی ایڈیشن انٹرنیٹ پر موجود نہیں ہے۔)

''جامعہ بنوریہ عالمیہ میں آکر ہندو لڑکی سمیت دو افراد نے اسلام قبول کرلیا''

کراچی (پ ر) جامعہ بنوریہ عالمیہ کے رئیس وشیخ الحدیث مفتی محمد نعیم کے ہاتھ پر لڑکی سمیت دو افراد نے ہندومت سے تائب ہو کر اسلام قبول کرلیا۔ جامعہ بنوریہ عالمیہ کے ترجمان کے مطابق جمعرات کو جامعہ بنوریہ عالمیہ میں میر پور خاص سے ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے 25 سالہ رانی ولد روپو اور عمر کوٹ کے ہندو نوجوان 30 سالہ کرشن ولد وسند نے جامعہ بنوریہ عالمیہ آکر قبول اسلام کی خواہش کا اظہار کیا جس پر جامعہ میں ایک سادہ اور پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں رئیس وشیخ الحدیث مفتی محمد نعیم نے دونوں نومسلموں کو کلمہ پڑھا کر دائرہ اسلام میں داخل کیا اور رانی کا اسلامی نام رضیہ اور کرشن کا اسلامی نام عمر تجویز کیا۔ اس موقعے پر تقریب میں شریک علماء کرام اور طلبہ نے نومسلموں کو مبارک باد پیش کی اور ان کی

استقامت کے لیے دعا کی گئی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے یہ پریم کہانی کیوں بیان کی، اور شاید یہ بھی سوچ رہے ہوں کہ آخر مذہب تبدیل کرنے کی وجہ کیا بنی؟ ہم اس بارے میں کوئی حتمی رائے تو نہیں دے سکتے، ہاں ایک وجہ ذات پات ہو سکتی ہے، کہ جب عشق کے آگے ذات آنے لگے تو تبدیلی ء مذہب ہی وہ آسان راستہ بچتا ہے جس سے عشق بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور تحفظ بھی، چنانچہ پسند کی شادی کرنے والا ہر فرد اپنے تحفظ کے لیے مذہب کا سہارا لیتا ہے خواہ وہ اس کا اپنا مذہب ہو یا کسی اور کا۔

❁

ہندو بہن اور مسلمان بھائی

پاکستان میں مذہبی رواداری اور بھائی چارے کے سلسلے میں پوری دنیا میں تحفظات پائے جاتے ہیں۔ اس بارے میں ایک بات بہت ہی مشہور ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اور مسلمان لوگوں کے درمیان بہت زیادہ دوریاں ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اس بات میں کچھ حد تک صداقت ہو لیکن غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت، بھائی چارے، اور مذہبی رواداری کی بھی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اس بارے میں ہم اپنے گزشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح کراچی میں بھگوان کی رتھ یاترا کے لیے مسلمانوں کی جانب سے بگھیاں فراہم کی جاتی ہیں، اور کس طرح کراچی کے ہندوؤں نے عوامی سہولت کے لیے شہر کے کئی مقامات پر سبیلیں قائم کی تھیں، جن میں کچھ تو آج بھی جاری ہیں۔ مگر آج ہم ایک ایسے رشتے کا ذکر کریں گے جو ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان ہے، اور یہ رشتہ گزشتہ پانچ سالوں سے نہ صرف قائم ہے، بلکہ روز بہ روز پختہ اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک ہندو خاتون منگلا اور اس کے مسلمان بھائی ماجد حسین کے درمیان بھائی بہن کا رشتہ ہے۔ اس رشتے کا آغاز اس وقت ہوا جب منگلا کنواری تھی۔ اب وہ شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔ مگر ماجد حسین ہر برس منگلا کے گھر رکھشا بندھن تہوار کے موقع پر ضرور جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کریں گے لیکن اس سے قبل راکھی کے تہوار کے بارے میں کچھ تاریخی حقائق سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔

دنیا بھر میں ہندو برادری رکھشا بندھن کا تہوار جوش وخروش سے مناتی ہے۔ اس موقعے پر

ہندو گھرانوں میں بہنیں چاول اور دیے سے سجی پوجا کی تھالی تیار کرتی ہیں۔ اس تھالی میں راکھی کی ڈوری بھی ہوتی ہے، جو ایک بہن اپنے بھائی سے محبت کے اظہار کے لیے رکھتی ہے۔ پوجا ختم ہونے کے بعد بہن اپنے بھائی کی کلائی پر وہ خوب صورت ڈوری باندھتی ہے اور ڈوری باندھنے کے بعد بھائی اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے اور دل ہی دل میں زندگی بھر اس کی حفاظت (رکھشا) کا وعدہ کرتا ہے۔ راکھی باندھنے کے بعد بھائی پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ بہن کے لیے تحفے کے طور پر اپنی استطاعت کے مطابق رقم دے۔ اس موقعے پر بہنیں اپنے بھائیوں کی لمبی عمر اور ان کے تحفظ کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس رشتے کی پاس داری کے بارے میں بہت سی کہانیاں عام ہیں۔ اس ضمن میں پہلی کہانی چتوڑ کی رانی 'رانی کرناوتی' اور مغل شہنشاہ ہمایوں کی بہت نمایاں ہے۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ رانی کرناوتی جو چتوڑ کی راجہ کی بیوہ تھیں، ان کی ریاست پر گجرات کے حکمران بہادر شاہ نے حملہ کیا۔ رانی اس حملے کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے ہمایوں کو راکھی بھجوائی۔ رانی کے اس رویے سے شہنشاہ ہمایوں بہت متاثر ہوا اور فوراً چتوڑ کی راہ لی تاکہ اس کا دفاع کیا جا سکے۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق ریاست ٹونک کے امیر انگریزوں سے مل کر مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لیتے تھے اور اس وقت تک وہ ٹونک کے نواب نہیں تھے بلکہ ان کی شہرت ایک جنگجو سردار کی تھی، جنھیں کرائے کے فوجی بھی کہا جا سکتا ہے جو پیسوں کے عوض کسی کی بھی فوج میں شامل ہو کر اس کے دشمن کے خلاف لڑ سکتے تھے۔ پھر یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنی قوت کی وجہ سے مستحکم ہوتے گئے۔ ٹونک اور جے پور ریاستیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ایک بار ٹونک کے نواب کے دل میں خیال آیا کہ جے پور کی ریاست کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیا جائے۔ اس ارادے سے انھوں نے جے پور پر حملہ کر دیا۔ جے پور کی رانی میدانِ جنگ میں ٹونک کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں، تاہم اس کا حل رانی نے یوں نکالا کہ ایک قاصد کے ذریعے خفیہ طور پر اپنا دوپٹہ ٹونک کے نواب کو اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ ایک بھائی کا بہن کی ریاست پر حملہ اس کو

'شوبھا' (زیب) نہیں دیتا۔ پیغام ملتے ہی ٹونک کے نواب نے فوجوں کو واپسی کا حکم دیا۔ اس تمام کارروائی کے بعد جب تک جے پور کی رانی زندہ تھیں، وہ ہر سال ٹونک کے نواب کو راکھی بھیجتی تھیں اور ٹونک کے نواب کی جانب سے بھی اپنی منہ بولی بہن کے لیے تحائف بھجوائے جاتے تھے۔

یہ تو تھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان استوار ہونے والے رشتوں کی مختصر تاریخ۔ مگر جیسا کہ ہم نے ابتداء میں ہندو بہن اور مسلمان بھائی کا ذکر کیا تھا، دراصل وہ کہانی ہے ہمارے فوٹو جرنلسٹ دوست ماجد حسین اور ان کی منہ بولی ہندو بہن منگلا کے درمیان بہن اور بھائی کے رشتے کی۔ ماجد حسین نے ہمیں یہ کہانی کچھ یوں سنائی:

''یہ 2010 کی بات ہے، رکھشا بندھن کے تہوار پر میں اور میرے ایک فوٹو گرافر دوست نے طے کیا کہ اس تہوار کی تصاویر بنائی جائیں۔ ہم نے لیاری کے قریب بھیم پورہ کے علاقے میں واقع ایک مندر کا انتخاب کیا۔ رکھشا بندھن کے دن ہم مندر میں پہنچے تو وہاں مختلف خاندان جمع تھے۔ ان خاندانوں کی بچیاں اپنے بھائیوں کے ہاتھ پر راکھی باندھ رہی تھیں۔ میری نظر ایک معصوم اور بھولی بھالی لڑکی پر پڑی۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ وہ لڑکی جب اپنے بھائی کو راکھی باندھے گی تو میں تصویر بناؤں گا۔ کافی وقت گزر گیا اس لڑکی نے کسی کو بھی راکھی نہیں باندھی جس سے مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ بالآخر میں نے لڑکی کے قریب جا کر پوچھا، ''کیا تمھارا کوئی بھائی نہیں جسے راکھی باندھ سکو؟'' تو وہ ایک چھوٹے بچے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولی کہ ''یہ میرا بھائی ہے اور میں اسے راکھی باندھ چکی ہوں۔'' میں مایوس ہو گیا مگر وہ میرے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں راکھی باندھتے ہوئے تمھاری تصویر بنانا چاہ رہا تھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی کہ ''اب تو آپ میری تصویر نہیں بنا سکتے کیونکہ میں راکھی باندھ چکی ہوں۔ ہاں لیکن ایک بات ہو سکتی ہے، آپ بھی تو میرے بھائی ہیں کیوں نہ میں آپ کی کلائی پر راکھی باندھ دوں؟ میں شش و پنج میں پڑ گیا، لیکن پھر میں نے دایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''لو، راکھی باندھ دو۔'' اس نے میرے دائیں ہاتھ کی کلائی پر ایک

سُرخ ڈوری جس میں مصنوعی موتی پروئے ہوئے تھے باندھ دی۔ اس کے بعد منگلا نے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے میری پیشانی پر تلک لگایا اور اپنے قریب پڑی ہوئی تھالی سے پرساد کا ایک پیڑہ اُٹھا کر میرے منہ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے میرے آگے سر کو جھکایا۔ میں حیران تھا کہ اب کیا کروں؟ تو وہ دھیمے سے بولی، ''بھائی سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے آشیرباد دیں۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جس کے بعد وہ سیدھی ہو کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور دایاں ہاتھ میرے سامنے بڑھاتے ہوئے ہتھیلی کھول کر کہا ''بھائی عیدی۔'' میری جیب میں زیادہ پیسے تو نہیں تھے لیکن تھوڑے بہت جو تھے وہ میں نے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ یہ قصہ تھا 2010 کا، پہلی راکھی کے وقت منگلا کنواری تھیں، اب ان کے دو بچے بھی ہیں۔ میں ہر سال رکھشا بندھن کے موقع پر وہاں جاتا ہوں، انھوں نے اپنے شوہر سے بھی میرا تعارف بھائی کی حیثیت سے کروایا ہے۔ رکھشا بندھن کے موقع پر جیبیں ٹٹول کر دیکھتا ہوں اور اگر پیسے نہ ہوں تو کسی سے ادھار بھی مانگ لیتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان بھائی کو ایک ہندو بہن کو عیدی دیتے ہوئے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔''

❊

حاجی نوشاد کی بگھی پر ہندوؤں کی رتھ یاترا

مسلمان کی بگھی پر ہندوؤں کا بھگوان سوار ہو تو یہ حیرت کی بات تو ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ واقعہ اکبر اعظم کے ہندوستان پر راج کے دوران پیش نہیں آیا جب ہندو اور مسلمان ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم تک تو صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ مشترکہ ہندوستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو اور مسلمان پانی کی آوازیں لگا کر ہندوؤں کو 'شدھ' اور مسلمانوں کو 'پاک' پانی پلایا جاتا تھا۔

میرے آبائی شہر میر پور خاص کے عین وسط میں بلدیہ میر پور خاص کی قدیم عمارت تھی، جس میں ایک خوب صورت لان تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے دورۂ میر پور خاص کے دوران اسی لان میں عوام سے خطاب کیا تھا۔ اب یہاں ایک شاپنگ سینٹر بنا دیا گیا ہے۔ شاپنگ سینٹر کی تعمیر کے وقت یہاں پر ایک ٹھنڈے پانی کی سبیل تھی، جو سیٹھ دھن راج مل نے 1960 میں عوام کی سہولت کے لیے قائم کی تھی۔ 1960 کی دہائی وہ تھی جب میر پور خاص میں ہندو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد میر پور خاص کے ہندوؤں کی بڑی آبادی اپنے گھر، زرعی زمینیں اور جائدادیں چھوڑ کر ہندوستان منتقل ہوگئی تھی۔

دھن راج مل نے 1960 میں پینے کے ٹھنڈے پانی کی یہ سبیل کیوں قائم کی۔ اسے اس بات کا بخوبی اندازہ تو ہوگا کہ میر پور خاص میں پانی پینے کے لیے ہندو تو نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن اس کے باوجود اس نے یہ سبیل بنائی۔ 1960 سے لے کر 1992 تک شہر کے مرکزی علاقے میں یہ واحد ٹھنڈے پانی کی سبیل موجود تھی جس سے 98 فیصد مسلمان استفادہ کرتے تھے، لیکن

1992 میں میر پور خاص کا حلیہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔

1992 کے بعد بلدیہ کا یہ وسیع اور کشادہ علاقہ ایک بہت مصروف کاروباری مرکز میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں 'بلدیہ شاپنگ سینٹر' بنایا گیا ہے۔ بلدیہ کے جس پارک میں قائداعظم نے تقریر کی تھی اس کا دُور دُور تک کوئی نشان بھی نظر نہیں آتا۔ دھن راج کی سبیل کی جگہ پر اب ایک دکان ہے۔ خیر ہم ذکر کر رہے تھے رتھ یاترا کا۔ رتھ یاترا کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں سب سے پہلا خیال بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما لال کرشن ایڈوانی کا آتا ہے۔ ایڈوانی صاحب کی جنم بھومی کراچی ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں ایک رتھ یاترا کی تھی۔ کراچی میں گزشتہ سات سال سے ایک رتھ یاترا منعقد کی جاتی ہے۔ اس سال بھی یہ رتھ یاترا منعقد ہوئی، جس میں پانچ سو سے زائد ہندو مرد و خواتین نے حصہ لیا۔ ان مرد و خواتین میں سے کچھ کے ہاتھ میں پاکستانی پرچم بھی تھے۔ اگر ایڈوانی نے یہ منظر دیکھا ہو تو ان کا دل خون کے آنسو رویا ہوگا۔ اس کی سادہ سی وجہ ہے کہ انھوں نے 25 ستمبر 1990 میں ہندوستان کے شہر سومناتھ سے اپنی رتھ یاترا کا آغاز کیا اور اس کا اختتام ایودھیا میں ہوا۔ اس یاترا کا بنیادی مقصد بابری مسجد کو مسمار کرنا تھا تا کہ اسی جگہ پر رام جنم بھومی تعمیر کی جاسکے۔ عقیدے کے پختہ ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ جس مقام پر بابری مسجد موجود تھی، ٹھیک اسی جگہ پر رام کا جنم ہوا تھا۔ اب بھی راسخ العقیدہ ہندوؤں کا یہ مطالبہ ہے کہ جلد از جلد اس جگہ پر رام جنم بھومی تعمیر کی جائے، لیکن یہ معاملہ تاحال ہندوستانی سپریم کورٹ میں زیرِ التوا ہے اور فیصلے کا منتظر ہے۔

ہاں تو ہم بات کر رہے تھے کراچی میں جگن ناتھ یاترا کی۔ کراچی میں یہ رتھ یاترا صدر کا علاقے میں ہوتی ہے۔ اس علاقے کے بالکل قریب وہ اسکول بھی موجود ہے جہاں لال کرشن ایڈوانی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

2005 میں ایڈوانی نے کراچی کا دورہ کیا تھا اور اپنے اس اسکول میں بھی کچھ وقت گزارا تھا۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انھوں نے 1992 میں جو رتھ یاترا کی تھی اس کا ایک ہی بنیادی مقصد تھا ''نفرت، نفرت، نفرت اور نفرت'' کی سیاست۔ لیکن کراچی میں جو رتھ یاترا ہوتی ہے

اس کی بنیاد ''محبت، محبت، محبت اور صرف محبت'' ہے۔

کراچی میں ہونے والی جگن ناتھ رتھ یاترا کا آغاز 2002 میں کرشنا کشور داس نے کیا۔ اب ان کے ساتھ ایک نوجوان نچیش بھی شامل ہیں۔ یہ یاترا شروع میں بہت ہی مختصر ہوا کرتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے گُرو راجا رام داس نے انھیں ہدایت کی کہ اس کام کو آگے بڑھاؤ۔ آج اس تقریب میں شرکت کے لیے لوگ آرمی پبلک اسکول کے قریب تک آتے ہیں اور چکر لگاتے ہیں لیکن کل یہاں پر لوگ لکی اسٹار سے آئیں گے۔ اور ان کی یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ سات سال بعد یہ کراچی میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا تہوار بن گیا ہے۔ مہاراج کے مطابق رتھ یاترا کا آغاز اڑیسہ سے ہوا تھا لیکن آج یہ پورے ہندوستان میں منائی جاتی ہے۔

اس یاترا کے دوران بھگوان کو مندر سے باہر لایا جاتا ہے اور جس رتھ پر بٹھایا جاتا ہے اس کے اطراف میں لگائی جانے والی رسّی کو پکڑنے والے اپنے پاپوں سے مکت (گناہوں سے پاک) ہو جاتے ہیں، جو نردھن (غریب) ہے تو وہ دھنی (امیر) بن جاتا ہے۔ سنتان کو سنتان سن کی پراپتی ہوتی ہے (بے اولادوں کو اولاد ملتی ہے)۔

ہمارے دوست نچیش جو اس رتھ یاترا کے منتظمین میں شامل ہیں، انھوں نے بتایا کہ کراچی کے مسلمانوں کے تعاون کے بغیر اتنی بڑی تقریب کا انعقاد ممکن نہیں۔ ان دوستوں میں علی ارمان بلتستانی، عابد، کنٹونمنٹ بورڈ کے کونسلر ایوب، آرٹلری میدان تھانے کے سلیم صاحب، صدر تھانے کے مہربان جناب لیاقت اور ملک صاحب کے تعاون کے بغیر اس طرح کی تقریبات کا انعقاد بہت مشکل ہوتا۔ اس دوران نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے کراچی کے مسیحیوں کی اسکاوٹ ٹیم نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔

ہمارے بلاگ کا عنوان 'حاجی نوشاد کی بگھی' پر رتھ یاترا ہے۔ میں اس عنوان کو درست سمجھتا ہوں اور یہ درست بھی ہوگا۔ کراچی کے علاوہ سندھ کے دیگر علاقوں میں یہ بگھیاں اب ناپید ہیں، لیکن کراچی میں موجود ہیں۔

یہ سواریاں مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہیں اور بگھی مالکان اور کوچوانوں میں اکثریت

مسلمانوں کی ہی ہے، لیکن وہ انھیں ہندوؤں کی مذہبی رسومات کے لیے نہ صرف بخوشی دیتے ہیں، بلکہ اس موقع پر ان کے کوچوان پوری دل جمعی سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مجال ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ ہماری بگھی ہندوؤں کو نہیں دی جائے گی۔

اگر آپ بگھی کے اگلے حصے پر دیکھیں تو بہت ہی منقش انداز میں 'شادی مبارک' لکھا نظر آتا ہے، لیکن پچھلے حصے پر 'حاجی نوشاد صابر علی' صاحب کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے گزشتہ بلاگ میں کراچی کے ہندو صحافی کے بارے میں ذکر کیا تھا کہ ان کے دفتر میں ان پر اپنے برتن الگ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اب ایسے ملک میں جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی مذہب کی بناء پر برتن الگ کر دیتے ہوں، وہاں ہندوؤں کو بھگوان سوار کروانے کے لیے مسلمانوں کی بگھی کس طرح مل جاتی ہے، یہ سوچنے کی بات ہے۔

خیر! ہم نے رتھ یاترا کے دوران بچ بچا کر، چھپ چھپا کر رش کے دوران بگھی کے کوچوان رحمت کو پکڑ لیا اور اس سے پوچھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ رحمت نے اپنے بائیں ہاتھ کی پانچویں انگلی سے ناک کھجاتے ہوئے، اور دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے نسوار نما ایک گولی نکال کر پھینکتے ہوئے کہا "بھائی ان ہندوؤں کی وجہ سے ہمارا کام چل رہا ہے۔ ابھی بھی تکلیف ہے؟" ویسے ہمیں تکلیف تو نہیں تھی، بس حیرانی تھی جس کی وجہ سے پوچھا تھا۔ ہمارے نزدیک تو یہ شہرِ کراچی میں مذہبی برداشت اور رواداری کی ایسی مثال ہے جو ہمارے لیے تمغے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں اگر ہندوؤں کو رتھ یاترا کے لیے مسلمان اپنی بگھی دیتے ہیں، تو یہی وہ شہر ہے جہاں ایدھی صاحب اپنے گھر میں ہندو لڑکی کے لیے مندر بنواتے ہیں، سکھ محرم کی سبیل لگاتے ہیں، مندر میں امام حسین کا تعزیہ موجود ہے اور ہندو عاشورہ کا جلوس نکالتے ہیں۔ ابھی رحمت کوچوان نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ اچانک ان کے گلے میں خرخراہٹ سی پیدا ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے زور سے زمین پر تھوکا۔ کیا بتاؤں مجھے ایسا لگا کہ جہاں تھوک گری تھی وہ زمین نہیں، بلکہ تمام لوگوں کی نفرت کی سیاست تھی۔

❋

غیر مسلموں کی نایاب سبیلیں

کراچی کے غیر مسلموں نے سخت گرمیوں کے موسم میں نہ صرف انسانوں کو ٹھنڈا پانی فراہم کرنے کے لیے سبیلیں قائم کیں، بلکہ ایسی بھی سبیلیں تھیں جو جانوروں کے لیے بنائی گئی تھیں۔

یہ سبیلیں کیماڑی سے لے کر سولجر بازار اور مزارِ قائد کے قریب موجود تھیں مگر اب یہ یا تو غائب ہوگئی ہیں، یا انھیں توڑ کر لینڈ مافیا نے قبضہ کرلیا ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر پانی پینے کے لیے سبیل قائم کرنے کی یہ رفتار تقسیم ہند کے بعد بھی جاری رہتی تو شاید ہیٹ اسٹروک کے نتیجے میں کراچی کے تقریباً گیارہ سو افراد ہلاک نہ ہوتے۔

غیر مسلموں کی ان سبیلوں پر لگی ہوئی تختیاں بھی بہت ہی دلچسپ اور قابلِ غور ہیں۔ کہیں کسی وفا شعار بیوی نے اپنے محبوب شوہر کی یاد میں سبیل قائم کی اور شوہر سے محبت کی داستان اس کی تختی پر لکھ دی، تو کسی بیٹے نے اپنی ماں اور باپ سے محبت کا اظہار ایک سبیل بنا کر کیا۔ ہم نے شہر بھر میں ایسی سبیلوں کی تلاش شروع کی جو تقسیمِ ہند سے قبل موجود تھیں۔ کچھ کامیابی بھی ہوئی، لیکن ہم سب سے پہلے جس پانی کی سبیل کا ذکر کرنا چاہیں گے وہ کراچی کے پرانے علاقے ٹھٹھائی کمپاؤنڈ میں واقع ہے۔ یہ ڈاؤ میڈیکل یونی ورسٹی کے مرکزی دروازے سے متصل ہے۔

1990 کے قریب جب میں نے سبیل کو دیکھا تھا تو اس کے احاطے میں منشیات کا استعمال کرنے والے فقراء اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھے، اور وقتِ ضرورت وہیں پیشاب و پاخانہ بھی کر لیتے تھے۔ 1995 کی بات ہے کہ میں وہاں سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا دس یا پندرہ کے قریب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں وہاں پر کھڑے ہو کر صفائی کروا رہے تھے، اور بڑی چاہت کے ساتھ کچھ

کاری گروں کے ساتھ سبیل پر لگے ہوئے پتھر بھی صاف کر رہے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کسی کو تو اس سبیل کا خیال آیا جو محبت کی نشانی ہے۔ یہ بچے ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی کے طالبعلم تھے۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ یہ نیکی کا کام جتنا بڑھے گا اس کا اتنا ہی فائدہ ہوگا۔

خیر ان بچوں کی سب سے خوب صورت بات یہ تھی کہ انھوں نے سبیل کی بحالی کے لیے اپنی کاوشوں کے اظہار کے طور پر ایک چھوٹی سی تختی بھی نصب کر دی۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اس پر کسی کا نام نہیں تھا۔ اس تختی پر انگریزی میں لکھا تھا:

IN CONTINUATION OF THE SPIRIT OF

APLIBAI MIRCHANDANI

THIS WATER TROUGH WAS PREPARED AND

RESTORED BY DOWNGRADUATES IN 1995

اپلی بائی میر چندانی کی کاوشوں کے تسلسل کے لیے پانی کی اس سبیل کی بحالی ڈاؤ کے گریجوئیٹس کی جانب سے 1995 میں کی گئی۔

یہ تو تھیں ڈاؤ کے گریجوئیٹس کی کاوشیں، لیکن جس خاتون نے یہ سبیل قائم کی، اس نے اس کے قیام کا ذکر کس محبت بھرے لہجے میں کیا ہے وہ یوں ہے:

OM

ERECTED BY APLINAI IN MEMORY OF

HER HUSBAND

MIRCHANDANI CHELLARAM DAYARAM DIWAN

LATE CITY SURVEYOR

اوم اپلی بائی کی جانب سے اپنے شوہر دیوان دیارام چیلارام میر چندانی آنجہانی سٹی سروییئر کی یاد میں 1927ء۔

یہ تو تھی ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی کے مرکزی گیٹ سے متصل پینے کے پانی کی کہانی۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اگر آپ کا وہاں جانا ہو، تو وہاں پیشاب کی بو اتنی ہے کہ آپ پانی تو کیا پیئیں گے، کھڑے بھی نہیں ہوسکیں گے۔ جن بچوں نے اس سبیل کو اصلی حالت میں بحال کرنے کی کوشش کی تھی، انھوں نے سبیل کا ظاہری حلیہ تو بحال کر دیا لیکن غالباً پانی کی فراہمی برقرار رکھنے کا طریقہ بھول گئے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مضمون چھپنے کے بعد ڈاؤ یونیورسٹی کی انتظامیہ کوئی ایسا بندوبست کرے کہ یہاں لوگ پیشاب کرنے کے بجائے ٹھنڈا اور میٹھا پانی پینے لگیں۔

جیسا کہ ہم نے آپ کو پہلے بتایا کہ ہمارے سروے کے دوران ایک ایسی سبیل نظر آئی جس میں پانی موجود تھا۔ یہ سبیل مزار قائد کے قریب ٹریفک پولیس کی چوکی کے قریب واقع ایک چھوٹے پارک کے عقب میں واقع ہے:

ERECTED BY

BYRAMJI EDULJI

IN MEMORY OF

LATE FATHER EDULJI AND MOTHER

NAWASBAI

1ST SEPTEMBER, 1893

یہ سبیل بہرام جی ایڈلجی نے اپنے آنجہانی والد ایڈلجی اور ماں نواس بائی کی یاد میں تعمیر کروائی۔

اس تختی کے بالکل نیچے ایک اور تختی بلدیہ کی جانب سے لگائی گئی ہے۔ اس پر تحریر ہے:

جانوروں کے پانی پینے کی جگہ۔ یہاں نہانے اور کپڑے دھونے والوں کے خلاف

سخت کارروائی کی جائے گی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب ہم سبیل کا جائزہ لینے لگے، تو اس کے عقب میں تین لوگ نظر آئے جو کپڑے دھو رہے تھے اور ایک شخص نہار رہا تھا۔ ہم نے کیمرا نکالا تو ان سب نے خطرناک نظروں سے ہماری طرف گھورا، جس سے ہم سمجھ گئے کہ ان کی نہاتے ہوئے تصاویر نہیں بنانی۔

ایک نوجوان جو تقریباً نہا چکا تھا، باہر نکلا اور ہمیں مشورہ دیا کہ ''فٹیل'' (پٹیل) پاڑے کے اندر بھی ایک سبیل ہے۔ ابھی اس کو بھی دیکھو۔ پرانا ہے۔ میں نے پوچھا تم ادھر پانی پینے آئے ہو؟ وہ بولا توبہ توبہ کرو، یہ کوئی جگہ ہے پانی پینے کا؟ ہم تو ادھری نہانے آیا ہوں۔ میں لہجے سے سمجھ گیا کہ یہ بلوچ ہے۔ میں نے بلوچی میں اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں نہانے آیا ہے۔ خدا بخش بولا کھلا جگہ پہ نہانے کا مزہ اور ہی ہے۔ دس روپیہ دیتا ہوں اور نہاتا ہوں۔ ایک باری، دو باری، تین باری۔ سردیوں میں ایک باری ہوتا ہے، گرمیوں میں تین باری ہوتا ہے، لیکن تیس روپیہ۔ ہم خدا بخش سے بات کر رہے تھے کہ ایک باریش شخص جنھوں نے اپنا نام عبدالرحمن بتایا، ہمارے قریب آئے اور فخریہ لہجے میں بولے: بھائی بلوچ کی باتوں میں مت آنا، وہاں کوئی سبیل وبیل نہیں ہے۔ اس سبیل کا انچارج میں ہوں اور یہاں جو بھی جانور گاڑیوں والے اپنے جانوروں کو پانی پلانے آتے ہیں، ان سے میں ایک روپیہ بھی نہیں لیتا۔ لیکن جو نہانے یا کپڑے دھونے آتا ہے تو دس روپے تو میں لے ہی لیتا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں سبیل کو پانی دینے والی پائپ لائن ٹوٹ گئی تھی، اس کے لیے بھیا میں نے 40 ہزار روپے دیے۔ اس کے بعد ہم نے طے کیا کہ سولجر بازار کے علاقے میں جانا چاہیے۔ ہمارے صحافی دوست اسحاق بلوچ نے بتایا تھا کہ وہاں بھی پانی کی ایک سبیل ہے، اس پر جلدی کوئی اسٹوری کرلو نہیں تو یہ بھی ختم ہو جائے گی۔

خیر ہم سولجر بازار مارکیٹ کے پاس پہنچے۔ پانی کی سبیل نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ ایک کونے میں جانوروں کا چارہ بک رہا تھا، اس کے قریب سبیل تھی۔ دوسری جانب گنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ایک شخص گنے چھیل رہا تھا۔ یہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک مختصر سی عمارت تھی، اور اس پر انگریزی میں تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ جب غور سے دیکھا تو ان تختیوں پر اس عمارت

کی تاریخ کچھ یوں تحریر تھی:

E. PUNTHAKEYFRAMROZE

TROUGHWATER

1925

BYERECTED

Society for the Prevention of Cruelty of)S. P. C. ATHE

KARACHI(Animals

OFAPPRECIATIONIN

SERVICESVALUABLEMOSTTHE

SOCIETYTHETORENDERED

BY

E. PUNTHAKEYFRAMROZEDR

SECRETARYHONORARYAS

YEARS42OFPERIODAFOR

(1921-1871)

1924

فرمروزای پنتھکی، پانی کی سبیل .1925 ایس پی سی اے (تنظیم برائے انسدادِ بے رحمیِ حیوانات) کی جانب سے فرمروز پنتھکی کی 42 سال اعزازی سیکریٹری کے طور پر خدمات کے صلے میں۔(1871-1921)

وہاں پر ہمیں ایک صاحب ملے جو گرمی کی وجہ سے قمیص اتارے بیٹھے تھے۔ جب ہم تصویریں بنانے لگے تو انھوں نے ہمیں پیار سے اپنے قریب بلایا اور چائے کی پیشکش کی۔ بولے: بھائی! یہ جو سبیل ہے، یہ انگریز کے دور کی نشانی ہے۔ اس وخت (وقت) یہ سارے

ہندو پارسی اور انگریز آدمیوں کے لیے نہیں جناوروں (جانوروں) کے لیے بھی سبیلیں بناتے تھے۔ لیکن اِب (اب) پانی ہی نہ آوے ہے تو سبیل کیا چلے۔ ہم بدایوں کے ہیں اور ہمارے بھائی تبسم بدایونی بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ کبھی نام سُنا ان کا؟ چھوڑ! تو تو بلوچ ہے، تیرا کیا لینا دینا شاعری سے۔ ہاں! ایک اور سبیل بھی ہے قریب میں، وہ بھی دیکھ لیجیو۔

پھر آنکھ کے اشارے سے کہنے لگے ''گنے والے کو چھوڑ یہ ساتھ میں جو جانوروں کا چارہ بیچ رہا ہے، ذرا اس سے بھی بات کر لیو۔'' ہم سبیل کے دوسرے حصے پر پہنچے جہاں پر ایک نوجوان جانوروں کے لیے چارہ بیچ رہا تھا۔ ہم نے تصویریں بنانے کے بعد اس سے پوچھا کہ وہ کب سے یہ کام کر رہا ہے، تو اس نے ساتھ بیٹھے ایک باریش شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا، اس سے پوچھو۔ میں نے بزرگوار سے نام معلوم کیا تو وہ بولے: امارہ (ہمارہ) نام گُل زمین ہے، ام (ہم) ادھری کراچی میں بوت (بہت) پہلے سے رہتا ہوں۔ یہ دکان ناجائز نہیں ہے۔ ایک باری بلدیہ والا تھوڑنے (توڑنے) کے لیے آیا تھا، لیکن تختی وختی دیکھ کے واپس چلا گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کہیں ہماری رپورٹ یا بلاگ کے بعد کوئی یہ سبیل گرانے یا اسے واگزار کروانے دوبارہ نہ آجائے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ اور اس سے منسلک کسٹم ہاؤس کی بلڈنگ کی طرف رُخ کرنے سے قبل سڑک کے بائیں جانب ایک پرانی پانی کی سبیل کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔

معروف محقق عارف حسن کے مطابق اس سبیل پر ''پہلاج رائے ریواچند پنجابی'' نامی ایک غیر مسلم کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، لیکن یہ تختی اب آپ کو نظر نہیں آئے گی بلکہ اس سبیل کی از سرِ نو بحالی کے حوالے سے ایک اور تختی لگی ہوئی ہے جس پر ریواچند کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تحریر ہے:

BEENHASTROUGHWATERTHE

RECONSTRUCTEDANDRESTORED

OFOCCASIONTHEON

HAMARA, KARACHI, 2007-E-JASHN

BY

GADDIMR. ARIF

COMMITTEECHAIRMAN, WORKS

TOWN, KARACHISADDAR

اس سبیل کی از سرِنو تعمیر اور بحالی کا کام ورکس کمیٹی صدر ٹاؤن جناب عارف گدی نے جشنِ ہمارا کراچی 2007 کے موقع پر کیا۔

عارف گدی صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے سبیل کی از سرِنو بحالی کا کام انجام دیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ان سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے جو افتتاح کیا، اس کی تختی تو موجود ہے لیکن جس شخص نے یہ سبیل قائم کی تھی اس کی تختی غائب ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بحالی کے بعد بھی اس سبیل میں پانی نہیں آتا۔ اس سبیل کے ساتھ ایک اور چھوٹی سی سبیل ہے جو تانبے کی ایک ٹنکی کی شکل میں ہے۔ اس سبیل میں ہر وقت پینے کا ٹھنڈا پانی دستیاب ہوتا ہے۔ یہ سارا کام جمیل نامی ایک شخص انجام دیتا ہے جو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے تعاون سے پانی اور برف کی فراہمی کے انتظامات کرتا ہے لیکن کسی صحافی سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جمیل کی اس سبیل کے ساتھ ایک اور کشتی نما پانی کی سبیل ہے جو بہت بڑی ہے۔ اس سبیل پر پنجتن پاک کے نام بھی تحریر ہیں لیکن یہ پانی سے محروم ہے۔

ایک اور سبیل لیاری کے علاقے بھیم پورہ میں ''ناگ ناتھ مندر'' سے متصل ہے۔ یہ سبیل جانوروں کے پانی پینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن اب اس سبیل میں پانی نہیں ہے۔ سبیل کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا ہے جو ایک مقامی شخص کے قبضے میں ہے۔ یہ سبیل ناگ ناتھ مندر کا حصہ ہے، لیکن اب ہندو اس پر ملکیت کا دعویٰ کریں بھی تو انھیں بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خصوصی طور پر دیوانی مقدمات۔

اس سبیل پر قبضے کی داستان اس کے سامنے چھوٹے سے کمرے پر لکھے ہوئے بورڈ پر یوں نظر آتی ہے:

یااللہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یارسول اللہ

فی سبیل اللہ

(یہ پانی صرف جانوروں کے لیے)

خدمت گار:

حاجی علی محمد بلوچ

ہم علی محمد بلوچ کی خدمات کا شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ جو سبیل وہاں پر موجود ہے اس میں پینے کا پانی موجود نہیں۔ کراچی میں گرمیوں کا موسم اپنے عروج پر آیا ہی چاہتا ہے۔ کمشنر کراچی نے لوگوں کو ٹھنڈا اور صاف پانی فراہم کرنے کے لیے سبیلیں پورے کراچی میں تو لگوائی ہیں، لیکن کیا ایسا ممکن نہیں کہ کراچی کی ان قدیم سبیلوں کو بھی مکمل طور پر بحال کیا جائے تاکہ نہ صرف لوگوں کو گرمی میں سکون میسر ہو، بلکہ انھیں قائم کرنے والوں کے نام بھی ہمیشہ قائم رہیں؟

❁

جی ایم سید اور ضیاء الحق کی ''سیاسی'' ملاقاتیں

کراچی کی حیدر منزل نہ صرف سائیں جی ایم سیّد کی سیاسی وسماجی زندگی کا آئینہ دار ہے بلکہ اس کے درودیوار ایک سیاسی تاریخ کا عملی نمونہ بھی ہیں۔ حیدر منزل وہ مقام ہے جہاں 1934 میں سندھ پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس پارٹی کے صدر بلاول بھٹو زرداری کے پڑنانا سر شاہ نواز بھٹو تھے۔

1941 میں جب سائیں جی ایم سیّد اور اللہ بخش سومرو کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہوئے تو اس کے حل کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے حیدر منزل کا دورہ کیا اور سیّد کو اللہ بخش سومرو کی حمایت پر قائل کر لیا جس کے نتیجے میں اللہ بخش سومرو دوسری بار سندھ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ سید 1940 میں جب مسلم لیگ سندھ کے صدر بنے تو محمد علی جناح ان سے ملاقات کے لیے حیدر منزل آئے۔ عوامی لیگ کے سربراہ اور بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمان نے بھی 1969 میں حیدر منزل کا دورہ کیا۔

حیدر منزل میں جو بڑے بڑے سیاسی اکابرین جی ایم سیّد سے ملاقات کے لیے آتے تھے، اُن میں خان عبدالغفار خان (باچا خان)، غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل، حیدر بخش جتوئی، سندھ اسمبلی کے پہلے اسپیکر میراں محمد شاہ، سر شاہ نواز بھٹو، شاہ مردان شاہ پیر پگارا، بیگم نسیم ولی خان، سابق وزیر اعلیٰ جام صادق علی اور دیگر شامل ہیں۔

ان سب کے علاوہ متحدہ قومی موومنٹ کے بانی الطاف حسین اور مہاجر قومی موومنٹ کے قائد آفاق احمد بھی حیدر منزل کا دورہ کرنے والوں میں شامل ہیں۔ حیدر منزل 1974 سے قبل اور بعد سندھ میں مختلف تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ ان تحریکوں میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، کراچی کی

مرکز سے واپسی اور ون یونٹ کے خاتمے کی تحریک نمایاں ہے۔ اس وقت حیدر منزل میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی کا مرکزی دفتر قائم ہے اور یہاں سے سیاسی سرگرمیاں تا حال جاری ہیں۔

سائیں جی ایم سیّد کا نام پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے وہ سیاسی افکار تھے جن کی بناء پر انھیں ملک دشمن اور غدار قرار دیا گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ نظر بندی میں بسر کیا۔ وہ پاکستان کے واحد سیاست دان تھے جن کا اصرار تھا کہ ان پر غداری کا جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا، اس کی سماعت مکمل کر کے انھیں سزا سنائی جائے یا ان کے مؤقف کو سچ تسلیم کیا جائے۔

سائیں جی ایم سیّد کی سیاست کا آغاز یوں تو ضلع دادو میں ان کے آبائی گاؤں 'سن' سے ہوتا ہے لیکن بعد ازاں انھوں نے تقسیم ہند سے قبل اور اس کے فوراً بعد کراچی کی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کراچی میں 1933 میں بابائے کراچی جمشید نسروانجی کی خواہش پر موجودہ نشتر پارک (سابقہ پٹیل پارک) کے علاقے میں حیدر منزل تعمیر کروائی۔

حیدر منزل مختلف سیاسی تحریکوں میں کا مرکز رہا۔ حیدر منزل کا دورہ کرنے والوں میں قائدِ اعظم محمد علی جناح صاحب بھی شامل تھے۔ حیدر منزل کا نام سائیں جی ایم سید نے اپنے پردادا سیّد حیدر شاہ سنائی کے نام پر رکھا۔ سیّد حیدر شاہ کو سندھ کی سیاست میں ایک ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔

حیدر شاہ نے سندھ میں ارغون دورِ حکومت سے قبل مہدی جونپوری، جس نے امام مہدی ہونے کا اعلان کیا تھا، کی کشتیاں سن کے قریب دریائے سندھ میں ڈبوئی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حیدر شاہ سندھ کے ایک بڑے عالم مخدوم بلاول سے بہت متاثر تھے، جنھوں نے اُس وقت مہدی جونپوری کے خلاف تحریک کا آغاز کیا تھا۔

جی ایم سیّد کی باقاعدہ سیاسی زندگی کا آغاز خلافت تحریک سے ہوتا ہے۔ 1919 میں جلیانوالہ باغ میں ایک المناک حادثے میں انگریز فوجی جنرل ڈائر نے برطانوی راج کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر مشین گنوں اور بندوقوں کے منہ کھول دیے جس کے نتیجے میں بے شمار لوگ شہید ہوئے۔ اس واقعے نے سیّد کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ 7، 8، 9 فروری 1920 کو پیر تراب علی

شاہ اور جان محمد جونیجو کی کوشش سے لاڑکانہ میں سندھ کے بزرگ پیر راشد شاہ 'جھنڈے والے' کی زیرِ صدارت سندھ خلافت کانفرنس کا اجلاس بلایا، جس میں مخدوم معین الدین کھہیاری والے اور سیّد اسد اللہ شاہ ٹکھڑائی کے ساتھ سیّد بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا شوکت علی، شیخ عبدالمجید اور دوسرے حضرات شریک ہوئے۔ باوجود نوجوانی کے سیّد نے 17 مارچ 1920 کو اپنے آبائی شہر سن میں اس حوالے سے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں ترکوں کی مدد کے لیے چندہ جمع کیا گیا اور کئی سیاسی رہنماؤں نے انگریز سرکار کی جانب سے دی گئی مراعات اور القاب واپس کیے۔

سیّد کی گاندھی جی کے ساتھ ملاقات 27 اپریل 1921 کو سن اسٹیشن پر ہوئی جب وہ حیدرآباد سے دادو جا رہے تھے۔ گاندھی جی نے سیّد کو اس مختصر ملاقات میں کھدر پہننے کی تلقین کی اور سیّد نے اس پر عمل کرتے ہوئے 19 مئی 1921 سے کھدر پہننا شروع کیا۔ سیّد کا یہ رویہ انگریز سرکار کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ انھوں نے اس طرزِ عمل پر دھمکی دی کہ چونکہ ان کی ملکیت ''کورٹ آف وارڈس'' میں ہے اور اس سے جو رقم سیّد خاندان کو مل رہی ہے، وہ بند کردی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ سیّد 1924 تک خلافتِ تحریک کا ایک فعال حصہ رہے۔

ان کا کراچی سے ایک مضبوط اور مربوط رشتہ رہا ہے۔ 1928 میں وہ ضلع لوکل بورڈ کراچی کے صدر منتخب ہوئے اور بورڈ کے زیرِ اہتمام ترقیاتی اور تعمیری کاموں میں بہت فعال کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ سیّد کراچی میں کام کرنے والی مختلف تنظیموں کے رکن یا عہدیدار رہے۔

جی ایم سیّد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ وہ کراچی لوکل بورڈ کے صدر تھے اور بورڈ کی ایک نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن برطانوی راج اس بات کے درپے تھا کہ کسی طرح سے وہ اس عمارت کا افتتاح نہ کر پائیں۔ سیّد ایک روشن خیال اور مذہبی رواداری کے علمبردار تھے۔ اس لیے انھوں نے جب اس عمارت کا باقاعدہ افتتاح کروایا تو اس موقعے پر مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کی جانب سے دعائیں کروائی گئیں۔

مولوی محمد صادق نے تلاوت کلامِ پاک سے اس تقریب کا آغاز کیا۔ مسیحی ریورنڈ ایلگر نے

اپنے مذہبی دعائیہ کلمات پیش کیے۔ پارسیوں کی جانب سے ڈاکٹر ایم ایف ڈھالا نے اپنی مذہبی کتاب کا حوالہ پڑھ کر سنایا، جس کے بعد ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے پنڈت وشوناتھ شاستری نے گیتا کے اشلوک سنائے اور آخر میں بھائی دھرم سنگھ نے بھی گرونانک کی تعلیمات میں انسان دوستی کا ذکر کیا۔ سیّد 1937 میں پہلی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 27 اپریل 1942 کو سندھ مسلم لیگ کے صدر سر حاجی عبداللہ ہارون کی وفات کے بعد انھیں سندھ مسلم لیگ کا صدر مقرر کیا گیا۔ 3 مارچ 1943 کو سید نے سندھ اسمبلی میں وہ معروف قرارداد پیش کی جو قیامِ پاکستان کی بنیاد قرار پائی۔ قرارداد کا متن یہ ہے:

''سندھ سرکار کو یہ اسمبلی سفارش پیش کرتی ہے کہ وائسرائے ہند کی معرفت بادشاہ سلامت کی حکومت کو سندھی مسلمانوں کے مندرجہ ذیل جذبات اور خواہشات سے واقف کروائے۔'' جیسا کہ ہندوستان کے مسلمان مذہب، فلسفہء حیات، معاشی رسوم، ادب، روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کے مختلف ہونے کے سبب ایک علیحدہ قوم ہیں اور ایک علیحدہ قوم کی حیثیت میں ہندوستان کے جس بھی خطہء زمین میں اکثریت میں ہیں، وہاں ''آزاد اور خود مختار قومی حکومتیں'' قائم کرنے کے حقدار ہیں۔

> اس لیے صوبہء سندھ کے مسلمان پُر زور طریقے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کو ایسا کوئی بھی آئین قبول نہیں ہوگا، جو ان کو ایک مرکزی حکومت میں دوسری اکثریتی قوم کے ماتحت رہنے پر مجبور کرے۔ اس لیے مستقبل میں آزادانہ زندگی گزارنے اور علیحدہ نظریہ حیات کے مطابق ترقی کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کو علیحدہ آزاد قومی حکومتیں قائم کرنے دی جائیں۔ کوئی بھی ایسی کوشش جو ان کو جبراً ایک مرکزی حکومت کے ماتحت رکھے گی، وہ ان کو قبول نہیں ہے بلکہ ایسی کوشش لازمی طور پر ملک میں خانہ جنگی اور دوسرے خوف ناک نتائج کی صورت میں نمودار ہوں گی۔

جی ایم سیّد اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب انھوں نے

سندھ اسمبلی کے انتخابات کے لیے اپنے پسندیدہ امیدواروں کی فہرست روانہ کی۔ اس فہرست کو ان کے مخالفین نے رد کر دیا اور قائدِ اعظم نے ان کے مخالفین کے مؤقف کی حمایت کی جس کے بعد مسلم لیگ اور سیّد کی راہیں جدا ہو گئیں۔ جنوری 1946 کے انتخابات میں سیّد کی پارٹی کے چار ارکان صوبائی اسمبلی کے رکن بنے، جن میں ان کے علاوہ سیّد محمد علی شاہ، سیّد بقادار شاہ اور غلام مصطفیٰ بھرگڑی شامل تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے سیاسی منظرنامے پر بھی سیّد نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ 1948 میں انھوں نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف مہم کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ 1953 میں سندھ اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے منتخب ہوئے، انھوں نے ون یونٹ کی مخالفت کی اور اس کا نتیجہ ان کی گرفتاری پر منتج ہوا۔

سیّد کی عملی سیاست کا اختتام اس وقت ہوا جب انھیں 1970 کے عام انتخابات میں دادو سے حلقے میں شکست ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار ملک سکندر نے انھیں شکست سے دوچار کیا۔ سیّد عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اس کے بعد انھوں نے سندھ کے حقوق حتیٰ کہ سندھ کی آزادی کا علم بلند کر دیا۔ خادم حسین سومرو اپنی کتاب ''جی ایم سیّد — آدرشی انسان سے اوتار تک'' کے صفحہ نمبر 418 پر لکھتے ہیں:

''ضیاء الحق سائیں جی ایم سیّد سے ملنا چاہ رہے تھے۔ انھوں نے میر علی محمد تالپور، حاجی مولا بخش سومرو اور الٰہی بخش سومرو کے ذریعے سیّد کو پیغام بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں۔ سید نے ان حضرات سے کہا کہ ملاقات کے لیے کوئی ایجنڈا ہے یا ایسی ملنا چاہ رہے ہیں۔ اگر ایجنڈا ہے تو مسٹر ضیاء الحق نے جی ایچ کیو کو آگاہ کیا ہے اور اس ایجنڈے پر بات کرنے کی جی ایچ کیو نے انھیں اجازت دی ہے یا نہیں؟ باقی ایسی ملاقات کوئی معنی نہیں رکھتی۔ سید کی یہ بات جب ضیاء الحق کو بتائی گئی تو انھوں نے کہا کہ سید کی وضاحت طلبی درست ہے۔''

سید کو سن (دادو) میں نظر بندی کے دوران دل کا دورہ پڑا اور حیدرآباد کے ''دیوانِ مشتاق وارڈ'' میں داخل کیے گئے۔ اس دوران ضیاء الحق بھی حیدرآباد کے دورے پر تھے، انھوں نے

دیوانِ مشتاق وارڈ میں سید کی عیادت کی۔ سید سے ملاقات کے دوران ضیاء الحق نے کہا کہ شاہ صاحب آپ ملاقات کرنے سے کیوں اجتناب برت رہے تھے؟ سید نے دوٹوک الفاظ میں ضیاء الحق کو کہا کہ ایک تو کوئی ایجنڈا نہیں تھا، دوسری بات سرائیکی شعر:

اُٹھاں میھاں دا کہڑا میلا

او چرن جھنگ او چرن بیلا

(بھینسیں اور اونٹ آپس میں کیسے مل سکتے ہیں؟ بھینسیں جنگل میں رہتی ہیں جہاں پانی ہوتا ہے، جب کہ اونٹ صحراؤں میں رہتے ہیں اور وہ کئی دنوں کا پانی اپنے جسم میں محفوظ رکھتے ہیں۔)

''ضیاء الحق نے سید سے کہا کہ ہمارے اسلامی پروگرام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ سید نے کہا کہ بنیادی جمہوریت، اسلامی سوشلزم اور اسلام کے نعروں کے پیچھے اقتدار میں رہنا ہی مقصد ہے۔'' یہ تھی سید سے ضیا کی پہلی ملاقات۔ دوسری ملاقات مرحوم میر علی محمد تالپور کی تدفین کے وقت ہوئی تھی، جس میں سید اور ضیاء الحق نے نمازِ جنازہ ایک ساتھ پڑھی تھی۔ ضیاء الحق نے سید کو اس دوران کہا کہ میں آپ کی لائبریری دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن پنجاب میں پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتوں نے شور مچایا کہ ضیاء الحق کو ملک دشمن کے ساتھ نہیں ملنا چاہیے اور سندھ میں پیپلز پارٹی کے حامی، کمیونسٹ اور ترقی پسند شور مچا رہے تھے کہ سید کو ایک آمر سے نہیں ملنا چاہیے۔

سید کے ساتھ ضیاء الحق کی تیسری ملاقات سابق وزیرِاعظم محمد خان جونیجو کی بیٹی کی شادی کے موقع پر نیاری کی جاموٹ برادری کے یہاں ہوئی تھی جس میں سید کو ضیاء الحق نے کہا تھا کہ مجھے آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے، میں سن ضرور آؤں گا۔

سید نے انھیں طنزاً کہا کہ پنجاب میں جلوس اور شور کی وجہ سے ملاقات سے ڈر گئے ہو۔ اس ملاقات میں سید نے انھیں کہا کہ چھوٹی قوموں کو حقوق دلوانے کے لیے آپ کردار ادا کریں اور میں بھی آپ کی ہندوستان سے کشمیر کے معاملے اور پاکستان میں چھوٹی قوموں کے حوالے سے مدد کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس کے

بعد سیّد سے ضیاء الحق کی کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی۔

لیکن خادم حسین سومرو کے حوالے کے باوجود ہم یہاں اس بات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ جنرل ضیاء نے لیاقت میڈیکل کالج میں سیّد سے ملاقات کی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) جہانداد خان اپنی کتاب ''پاکستان: قیادت کا بحران'' میں لکھتے ہیں:

''اس مرحلے پر ملک میں ایک دلچسپ افواہ اُڑی کہ جنرل ضیاء اور جی ایم سیّد کے مابین گہرے مراسم فروغ پا رہے ہیں۔ صدر کے جی ایم سیّد سے رابطوں کے بارے میں عجیب عجیب خبریں اخباروں کے صفحات کی زینت بن رہی تھیں جو آزاد سندھو دیش کے زبردست حامی تھے۔''

لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ پی پی پی کی دشمنی میں کیا جا رہا ہے۔ ان کہانیوں کا مقصد عوام کو یہ باور کروانا تھا کہ جنرل ضیا حزبِ اختلاف سے خوف زدہ ہو کر شیطان کو بھی گلے لگانے پر تیار ہیں۔ حقیقت صرف اتنی سی تھی کہ وفاقی وزیر الٰہی بخش سومرو نے جنرل ضیاء کو قائل کر لیا تھا کہ وہ 1985 کے انتخابات سے قبل ایک بار جی ایم سیّد سے ضرور ملاقات کر لیں جو اُس وقت لیاقت میموریل ہسپتال، حیدر آباد میں زیرِ علاج تھے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ایم آر ڈی (تحریکِ بحالیِ جمہوریت) نے انتخابات سے قطع تعلق کرنے کا اعلان کیا تھا اور جنرل ضیا کو اپنے ریفرنڈم اور انتخابات میں حمایت کرنے والوں کی تلاش تھی۔ اس لیے جی ایم سیّد سے ملاقات کا مقصد سیاسی تھا تا کہ سیاسی عمل کو تقویت حاصل ہو اور انھیں زیادہ سے زیادہ سندھیوں کی حمایت مل جائے لیکن جنرل ضیا نقصانات کا اندازہ لگائے بغیر اس غلطی کے مرتکب ہونے والے نہیں تھے۔

جنرل ضیا کے اس رویے سے معمر سندھی رہنما بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ جنرل ضیا نے بھی اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے جی ایم سید کے پوتے کو پی آئی اے میں ملازمت کرنے کی پیش کش کر دی اور انھیں مکمل اختیار دے دیا کہ وہ ضرورت پڑنے پر حکومت سے ہر قسم کی امداد طلب کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ ملاقات بہت زیادہ مفید ثابت نہ ہوئی۔ جی ایم سیّد کو جیئے سندھ کے کارکنوں کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ سیاسی لحاظ سے یہ ملاقات جیئے سندھ تحریک کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ اپنے سلوک کی بدولت جنرل ضیا نے اپنی حکومت کے خلاف ایک سخت ترین قوم پرست تحریک کو تقریباً بے اثر کر دیا۔

جنرل ضیا، جی ایم سیّد سے دوسری بار اس وقت ملے جب وہ جناح ہسپتال کراچی میں بہ غرضِ علاج داخل تھے۔ سیّد صاحب نے جنرل ضیا کا شکریہ ادا کیا اور میری موجودگی میں درخواست کی کہ آئندہ اگر ملاقات کے لیے تشریف لائیں تو جتنی خاموشی سے آسکیں، آئیں، کیونکہ ہر بار انھیں اپنی جماعت کے کٹر کارکنوں کی خفگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دونوں شخصیات میں کوئی اور وجہ دوستی کی نہیں تھی سوائے پی پی پی کی مخالفت کے۔ دونوں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ایک دوسرے سے کام لینا چاہتے تھے۔

سندھ کی آزادی کے حوالے سے سیّد کے مؤقف اور تحریک کے سلسلے میں مختلف آراء تھیں۔ ممتاز علی بھٹو اور دوسرے اکابرین کا کہنا تھا کہ سیّد نے یہ مؤقف وقت سے پہلے پیش کر دیا تھا۔

ان کو اپنے سیاسی خیالات کے سبب سب سے بڑی مخالفت کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب وہ ایک پروگرام کے تحت کراچی سے سکھر روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق دورہ ضلع شکارپور سے شروع ہونا تھا جس کے تحت شکارپور، جیک آباد، سکھر، خیرپور، نوشہروفیروز اور نواب شاہ میں سید کو مختلف مقامات پر تعزیت کرنی تھی، دعوتوں میں شرکت اور جلسوں سے خطاب کرنا تھا۔

سیّد، یکم اکتوبر 1989 کو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز سکھر روانہ ہوئے، سیّد جہاز میں ہی تھے کہ اس دوران سکھر ایئرپورٹ پر پاکستان کا پرچم نذرِ آتش کر دیا گیا۔ پرچم کس نے جلایا، اس میں کس کا ہاتھ تھا، اس کے پیچھے کیا منصوبے اور مضمرات تھے؟ ابھی تک اس کے متعلق کوئی بھی صحیح معلومات میسر نہیں آسکیں لیکن اس بات نے سیّد کے تمام دورے پر بہت برے اثرات مرتب کیے اور پارلیمنٹ سے لے کر تمام مرکزی جماعتوں نے کارروائی کا مطالبہ کیا۔

انھیں 1973 سے 1987 تک نظر بند رکھا گیا۔ 1987 میں رہا ہوئے لیکن 1987 میں

دوبارہ تین ماہ کے لیے نظر بند کردیے گئے۔ بعدازاں رہا کردیے گئے اور پھر 1992 میں نظر بند کر دیے گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام حیدر منزل میں ہی بسر کیے۔ دوران نظر بندی ان کی طبیعت خراب ہونے کے باعث حیدر منزل سے انھیں جناح ہسپتال منتقل کیا گیا۔ جہاں 25 اپریل 1995 کو وہ آزاد سندھ کا خواب لیے دنیا سے کوچ کر گئے۔

آج انھیں قوم پرست حلقوں میں سندھ کی آزادی کا علمبردار تصور کیا جاتا ہے، تو دوسری طرف انھیں پاکستان دشمن اور غدار قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں تصورات کے درمیان وہ جی ایم سید شاید کہیں کھو گیا ہے جس نے انجمنِ ترقیٔ اردو میں بھی فعال کردار ادا کیا تو تھیوسوفیکل سوسائٹی کی مختلف برانچوں میں بھی کام کیا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پیغام پر کتابیں اور مضامین لکھے تو ہاریوں کے حقوق اوران کے استحصال کے خاتمے کے لیے بے پناہ انجمنیں بھی قائم کیں۔ وہ فری میسن تنظیم کے رکن تھے جس پر پاکستان میں پابندی عائد کردی گئی تھی۔

سائیں جی ایم سید کی سیاست، ان کے نظریات، دوسری قومیتوں کے بارے میں ان کی آراء سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک بات جس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا، وہ یہ کہ وہ ایک علمی اورادبی شخصیت تھے، اوراتنے بلند پائے کی شخصیت تھے کہ ان کی ذات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

❋

پیر علی محمد راشدی کے 'شاہی مشورے'

گوکہ پاکستان کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ہے اور صرف 72 برسوں پر محیط ہے، اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں دو لفظوں سے خصوصاً شناسائی ہوتی ہے: سیاست اور سازش۔ جو لوگ سیاست کرتے ہیں، وہ اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی کارروائی کو سازش قرار دیتے ہیں اور جن لوگوں کو سازش کا موردِ الزام ٹھہراتے ہیں ان کے بارے میں دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ ذاتی مفادات اور ذاتی پسند و ناپسند کی وجہ سے ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ سیاست دانوں کو دیس نکالا مل جاتا ہے۔ انھی میں ایک ایسا کردار بھی ہے جس نے پاکستانی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا اور سیاسی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کیا۔ اس مضمون میں ہماری کوشش ہوگی کہ قاری کو یہ بھی معلوم ہو سکے کہ تاریخ دان انھیں کس حوالے سے یاد کرتے ہیں، اور یہ بھی کہ سیاست اور سازش کو مؤرخین کی زبانی بیان کیا جا سکے۔

پیر علی محمد راشدی سندھ کی سیاسی تاریخ کا ایک ایسا کردار ہیں جو ہر دور میں انمول رہے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی اصولی سیاست نہیں بلکہ تقسیم ہند سے قبل اور اس کے بعد انگریزوں سمیت مسلمان حکمرانوں، خواہ وہ آمر ہوں یا جمہوریت پسند، کو دیے جانے والے ایسے مشورے تھے جن کے ذریعے وہ اپنے اقتدار کو طول دے سکتے تھے۔

تقسیم ہند سے قبل پیر پگارا کے والد سورھیہ بادشاہ (سید صبغت اللہ شاہ راشدی) کو انگریزوں سے سزائے موت دلوانے میں بھی انھوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ انگریز سے اس وفاداری کا مقصد ان سے محبت نہیں تھی، بلکہ ان کی نظریں پیر پگارا کی گدی پر تھیں۔

پیر پگارا کے پرمزاح لہجے میں سیاسی انکشافات پر مبنی کتاب ''باتیں پیر پگارا کی'' جسے معروف صحافیوں الیاس شاکر اور مختار عاقل نے مرتب کر کے جنوری 1992ء میں شائع کیا، اس میں شامل ایک انٹرویو میں شاہ مردان شاہ راشدی (پیر صاحب پگارا) نے اپنے والد سید صبغت اللہ شاہ راشدی (سورھیہ بادشاہ) کی سزائے موت میں علی محمد راشدی کے کردار کو یوں بیان کیا ہے:

س: وہ کون صاحب تھے جنھیں انگریزوں نے اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا؟

ج: کیا اس کا نام بتانا ضروری ہے؟ اتنا کافی نہیں کہ وہ صاحب اور ان کے آقا اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔

س: تاریخ کے ریکارڈ کو درست رکھنے کے لیے ان کا نام اور دیگر متعلقہ واقعات ریکارڈ پر لانا ضروری ہیں، جبکہ آپ خود بھی اس سے پیشتر تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

ج: تو لیجیے ــــ وہ پیر علی محمد راشدی تھے جو چوتھی پشت میں ہمارے خاندان میں آملتے ہیں۔ انگریز نے پیر صاحب شہید کے خلاف مقدمے میں اِن سے بہت کام لیا تھا۔ انھیں انگلش سرکار نے سرکاری گواہوں کے بیانات تیار کرنے اور گواہوں کو مقدمے کے لیے train (تربیت) کرنے پر لگایا تھا۔

''پیر علی محمد راشدی گواہوں کے بیانات پہلے خود سنتے، پھر فائنل پرفارمنس کے لیے عدالت بھیج دیتے۔ ہمارے والد صاحب کے وکیل نے ہمیں ان تمام واقعات سے آگاہ کیا کہ کیسے پیر علی محمد راشدی نے انگریزوں کی منشا کے مطابق گواہیاں بھگتائیں۔ انگریز اس خدمت کے صلے میں انھیں پیر پگارا کی گدی بخش دینا چاہتا تھا اور علی محمد راشدی کی بھی یہی خواہش تھی، لیکن انھیں اور ان کے آقاؤں کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ایسا کیا گیا تو انھیں پھر ایک نئے طوفان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح انھیں اس کی ہمت نہ ہوئی۔'' پیر صبغت اللہ شاہ راشدی اور علی محمد راشدی

کا خاندان ایک ہی تھا۔ صبغت اللہ شاہ راشدی کو پھانسی دے کر نا معلوم مقام پر دفن کر دیا گیا تھا اور ان کے دونوں بیٹوں یعنی بڑے بیٹے شاہ مردان شاہ اور چھوٹے بیٹے سیّد نادر شاہ کو انگریز سرکار نے پہلے علی گڑھ اور پھر برطانیہ منتقل کر دیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد 1949ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے برطانیہ میں شاہ مردان شاہ سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ حکومتِ پاکستان انگریز سرکار کی جانب سے ان کی معزول گدی بحال کرے گی۔ لیکن ایسا 1949ء میں نہیں بلکہ 1952ء میں ہوا۔ جب پیر پگارا شاہ مردان شاہ سے ایک انٹرویو میں اِس کا سبب معلوم کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''ہوسکتا ہے کہ ہمارے وہی مہربان جو پیر صاحب شہید (سیّد صبغت اللہ) کے زمانے میں انگریزوں کے دستِ راست اور معاونِ خصوصی تھے اور آج مسٹر بھٹو کے خصوصی مشیر ہیں، ہماری وطن آمد سے پریشان ہوں اور ان دنوں ایوانِ اقتدار میں جو رسائی تھی، اسے خود اپنی کھال بچانے کے لیے استعمال کر رہے ہوں۔''

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پیر علی محمد راشدی صاحب اپنی ان تمام سرگرمیوں کے باوجود انتقال سے قبل جب ایک بار پیر شاہ مردان شاہ سے ملاقات کے لیے پیر جو گوٹھ گئے اور ان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انھیں پیرانِ پگارا کے قبرستان میں دفن کے لیے جگہ دے دی جائے تو پیر صاحب نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ یہ بزرگوں کی جگہ ہے، ہمارا تمھارا اُس میں کیا مقام۔

پیر علی محمد راشدی، ذوالفقار علی بھٹو کے مشیرِ اطلاعات تھے۔ ضیاء حکومت نے مارچ 1977ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے طریقۂ کار کے بارے میں ایک دستاویز بنام ''1977ء کے انتخابات کے طریقۂ کار پر قرطاسِ ابیض کا خلاصہ (مطبوعہ، حکومتِ پاکستان، راول پنڈی، جولائی 1978ء)'' جاری کی جسے بھٹو حکومت کی معزولی کے بعد منظرِ عام پر لایا گیا۔ اس دستاویز کے سرورق پر ایک دلچسپ جملہ تحریر ہے کہ:

اسے 25 جولائی 1978ء سے پہلے شائع نہ کیا جائے۔

یہ دستاویز جس کا نام ''قرطاسِ ابیض کا خلاصہ'' ہے، اس کی تفصیلی رپورٹ ''قرطاسِ

ابیض'' 600 سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی۔ اسے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں ایک ہزار سے زائد صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کا پیاں شامل کی گئی تھیں۔ قرطاسِ ابیض کے خلاصے کے صفحہ نمبر 10 پر ایک اقتباس ''راشدی منصوبہ'' کے عنوان سے درج ہے۔

مسٹر بھٹو کے مشیرِ اطلاعات، پیر علی محمد راشدی کی ذہانت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے مئی 1976ء میں ایک عملی تفصیلی پروگرام مرتب کیا جس کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اپوزیشن کی طرف سے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی صورت میں ایک کٹھ پتلی اپوزیشن کو سامنے لایا جائے۔

اقتباس: یہ کٹھ پتلی امیدوار بظاہر پورے جوش وخروش سے مقابلہ کریں لیکن سرکاری امیدواروں کے مقابلے میں شکست کھانے کے بعد انھیں کسی نہ کسی صورت میں معاوضہ دے دیا جائے۔

ان میں سے چند قابلِ اعتماد لوگوں کو ہمارے غیر اہم امیدواروں کے مقابلے میں کامیاب ہونے دیا جائے تا کہ وہ منتخب ہونے کے بعد اسمبلیوں میں ایک تعمیری ذمے دار اور دوستانہ اپوزیشن کا کردار ادا کریں، اور اس طرح جمہوری اقدار، پارلیمانی طریقوں اور ضابطوں پر عمل ہوتا رہے۔

انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کی طرف سے ٹی وی اور ریڈیو پر حزبِ مخالف کے لیے جتنا وقت دینے کا فیصلہ کیا جائے، اس کا زیادہ تر حصہ ان کٹھ پتلی امیدواروں کو دیا جائے اور اسمبلیوں میں جعلی اپوزیشن قائم کر کے اپوزیشن کے اہم امیدواروں کو منتخب ہونے سے روکا جائے۔

ہمیں حساس حلقوں اور ایسے افراد کی فہرست تیار کرنی چاہیے جنھیں کسی صورت بھی منتخب نہ ہونے دیا جائے۔ اس طرح کے مخصوص انتخابی حلقوں میں انتخابات کروانے کے لیے ہمیں خصوصی پروگرام تیار کرنا ہوگا۔

پیر علی محمد راشدی ایک انتہائی موقع شناس اور زیرک سیاست دان تھے۔ انھیں حکمرانوں کے قریب رہنے کا ہنر بخوبی آتا تھا۔ گو کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں حکمرانوں کی قربت کو معیوب

قرار دیا ہے، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پیر صاحب نے حکمرانوں کے قریب رہنے کے لیے ہر وہ عمل کیا جسے عام زندگی میں ناپسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

م ب خالد اپنی کتاب ''قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایوانِ صدر میں سولہ سال'' (مطبوعہ نظریہ پاکستان اکادمی، جولائی 2012ء) کے صفحہ نمبر 43 پر ''سرکاری دورے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ: گورنر جنرل غلام محمد جسمانی اعتبار سے ناتواں ہوتے ہوئے بھی سرکاری دوروں اور سیر و تفریح کے بڑے شوقین تھے — مشتے نمونہ از خروارے — ایک اندرونِ ملک اور دو بیرونِ ملک دوروں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

صوبۂ سندھ کے دورے پر تھے۔ حیدرآباد اور بھٹ شاہ سے ہوتے ہوئے موئن جودڑو اور لاڑکانہ پہنچے... سکھر میں گورنر جنرل کو دریائے سندھ میں کشتی کی سیر کروائی گئی۔ ایک بڑی کشتی میں گورنر جنرل اور ان کا عملہ، دوسری کشتی میں مقامی انتظامیہ، تیسری کشتی میں سکیورٹی اسٹاف اور چوتھی میں کھانے کی دیگیں رکھ دی گئیں۔

ایک صوبائی وزیر جو پیشے کے اعتبار سے صحافی تھے، گورنر جنرل کی میزبانی کے فرائض انجام دینے کے لیے ہمراہ تھے۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو مقامی انتظامیہ کے ایک افسر نے وزیر صاحب کے کان میں کہا، ''سائیں مانی تیار آہے'' (کھانا تیار ہے)۔ چاروں کشتیاں جڑ گئیں اور وزیر صاحب نے مقامی افسروں کے ہمراہ بیرے خانساموں کے فرائض انجام دیے۔

یہ وزیر صاحب جو بعد میں وفاقی وزیر اور آخر میں سفیرِ کبیر اور بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران مشیر بنے، بڑے کائیاں تھے۔ غلام محمد سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے تھے جسے ان کا ذاتی خدمت گار قاسم اتارتا اور پہنایا کرتا تھا مگر کیا مجال کہ وزیر صاحب نے قاسم کو ایک موقع بھی دیا ہو۔ وزیر صاحب تیر کی طرح کہیں نہ کہیں سے نکل آتے۔ گورنر صاحب کو جوتی پہناتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بوسہ دیتے۔

بے شمار خوبیوں کے علاوہ وزیر موصوف کی اضافی خوبی یہ تھی کہ سگریٹ نہ پیتے تھے، البتہ بیڑی پینے کا شوق تھا۔ بھرم رکھنے کے لیے ٹرپل فائیو (555) سگریٹوں کے ڈبے میں بیڑیاں

رکھتے اور بار برداری کا کام اپنے سرکاری پرائیویٹ سیکریٹری سے لیتے تھے۔ بیڑی کی طلب ہوتی تو پیچھے مڑ کر دیکھتے۔ پرائیویٹ سیکریٹری کامل تربیت یافتہ تھا، پھرتی سے آگے آتا، سر کو جھکاتا اور ادب سے کہتا،''سائیں بیڑی!'' سائیں بیڑی کو سلگا چکتے تو پرائیویٹ سیکریٹری واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر سر کو دوبارہ ہلاتا جیسے خدا کا شکر بجالا رہا ہو۔ جب وزیر اتنا اچھا ہو تو اس کا پرائیویٹ سیکریٹری تو بہت ہی اچھا ہوگا۔

ایوب خان کی بادشاہت کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ نمبر 179 پر لکھتے ہیں کہ:

البتہ ہمارے ایک سفیر کبیر جن کے نام کے ساتھ پیر کا لاحقہ بھی شامل تھا، بالکل پٹڑی سے اتر گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ خارجہ پالیسی پر اظہارِ خیال فرماتے جیسا کہ ان سے کہا گیا تھا، انھوں نے خارجہ پالیسی پر ایک لفظ کہے بغیر بعد از ادب آداب، آیتوں روایتوں اور تاریخی حکایتوں کے حوالے سے ایوب خاں کو باور کروانے کی کوشش کی کہ نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پوری امتِ مسلمہ اپنے طبعی مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ ہی کسی مردِ کامل کی محتاج رہی ہے اور آج وہ مردِ کامل جنرل محمد ایوب خاں کی شخصیت میں پاکستان کو میسر آچکا ہے۔ چنانچہ وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ آپ فی الفور پاکستان میں بادشاہت کے قیام کا اعلان فرما کر اس ملک و قوم پر احسانِ عظیم فرمائیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ نبض شناس، مرد شناس اور موقع شناس سفیرِ کبیر پیر علی محمد راشدی تھے۔

18 نومبر 1983ء کو روزنامہ ڈان میں الطاف گوہر کے حوالے سے چھپنے والی ایک رپورٹ میں جولندن سے یحییٰ سید نے بھیجی تھی، میں تحریر ہے کہ:

پیر علی محمد راشدی نے اپنے خط میں ایوب خان کو لکھا تھا کہ ایوب خان کو اس امر کا مجاز ہونا چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں میں سے یا اگر وہ بیٹوں کو اس قابل نہ سمجھیں تو باہر سے کسی کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کردیں۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنے خط میں مزید لکھا تھا کہ میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، پھر پاکستان کے سلسلے میں اور حال ہی

میں ون یونٹ کے سلسلے میں اہم کردار ادا کر چکا ہوں۔ میں ایک اور ایسی مہم کے لیے فلپائن سے آ کر پاکستان میں وقت نکال سکتا ہوں۔

2 دسمبر 1983ء کو الطاف گوہر کے جواب میں پیر علی محمد راشدی نے روزنامہ ڈان میں لکھا تھا کہ "یہ مشورہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی جب 1955ء میں 56ء کا آئین لکھا جا رہا تھا اور میں مرکزی کابینہ کا رکن تھا، میں نے آئین ساز کمیٹی میں موجود اپنے رفقاء کو یہ مشورہ دیا تھا، لیکن انھوں نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔"

پیر علی محمد راشدی کے اس بیان کے بعد الطاف گوہر نے وہ تمام دستاویزات، جن میں ایوب خان کو بادشاہت کا مشورہ دیا گیا تھا، شائع کر دیں۔ پیر علی محمد راشدی نے ان باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈان میں اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ "میرے خیال میں آج کسی بھی شخص کے لیے جو متعدد منسوخ شدہ آئینوں 1947ء، 1956ء، 1962ء لیگل فریم آرڈر اور تازہ ترین ڈھانچے کے ملبے پر ساکت وصامت بیٹھا ہوا ہے اور پیمان کشی وحلف توڑنے کے متعدد واقعات کا شاہد ہے، یہ کوئی نئی حیران کن اطلاع نہیں ہوگی کہ تقریباً چوتھائی صدی قبل جب ملک میں آئینی خلا پایا جاتا تھا اور کسی نئے آئینی فارمولے کی تلاش جاری تھی، جب مجھ سے سرکاری طور پر رجوع کیا گیا تو میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم برطانوی طرز کی آئینی بادشاہت کو آزما سکتے ہیں جس کے تحت تمام اختیارات عوام کے ذریعے منتخب ہونے والی پارلیمنٹ کے پاس ہوتے ہیں اور سربراہ مملکت کو کسی آرائشی شے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جو ترقی سالمیت اور وقار کے لیے ایک جذباتی علامت بن جاتی ہے۔

راشدی صاحب کہتے ہیں کہ "اس وقت کی صورتِ حال اتنی گمبھیر تھی کہ ایوب خان میرے پاس منیلا تشریف لائے، صرف ایک رات کے لیے، تا کہ صورتِ حال پر سیر حاصل بحث ہو سکے۔ میں اس وقت ایک وہاں ایک سفیر کے طور پر متعین تھا اور میرے پاس کوئی اختیار نہیں تھا کہ میں ان معاملات میں دخل دے سکوں۔"

لیکن ایوب خان نے شاید میرے سیاسی پس منظر کی وجہ سے یہ سوچا ہو کہ میں ان کو

ان مسائل پر کوئی کارآمد مشورہ دے سکتا ہوں، لہٰذا انھوں نے ملیلا میں اپنا قیام ایک دن کے لیے بڑھا دیا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں انھیں جلد ہی اپنی رائے سے آگاہ کروں گا جو کہ میں نے یکے بعد دیگرے دو یادداشتوں کے ذریعے انھیں پیش کی۔

علی محمد راشدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ:

روایتی طور پر جو شخص حاکمِ وقت ہوتا ہے، اسے عام آدمی کی نظر میں ایک تقدس حاصل ہوتا ہے۔ کسی مطلق العنان شخص کو قتل کرنا باعثِ ثواب ہے۔ اس کے برعکس بادشاہِ وقت کو قتل کرنے والا بہت بڑا مجرم ہے۔ اس کا سبق ہمیں اسلامی تاریخ سے وافر مقدار میں ملتا ہے۔ آئینی بادشاہت عملی طور پر بے ضرر ہوتی ہے۔ اس کی خود ستائشی کی خواہش سجے سجائے دفاتر سے پوری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مفاد کی خاطر جمہوریت اور اس سے وابستہ اداروں کو حیل و حجت کے بغیر کام کرنے دیتا ہے۔

ان کا یہ مزید دعویٰ ہے کہ:

آئینی بادشاہت، جمہوریت کو رد نہیں کرتی۔ جیسا کہ سیکڑوں سال کے انسانی تجربے سے ثابت ہے۔

م ب خالد نے وزیرِ موصوف کی سرگرمیوں کا مزید احوال اپنی کتاب میں یوں درج کیا ہے:

1960ء میں ایوب خان کو لائف پریزیڈنٹ یا بادشاہ بننے کا مشورہ دینے والے بزرگ 1958ء میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے زندہ سلامت تھے۔ حاضری لگوانے اور نمبر بنانے کا شوق اور فن قدرت کی طرف سے ودیعت تھا۔ اِن بزرگ کو 1953ء میں غلام محمد کو جوتیاں پہناتے اور پہنا کر اپنے ہاتھوں کو چومنے اور چوم کر جھومتے دیکھنے کا راقم عینی شاہد ہے۔ یہ مردم شناس ہی نہیں موقع شناس بھی تھے۔ کیسے ممکن ہے کہ ان سے چوک ہو گئی ہو۔ ان صاحب کو یا اس قماش کے دوسرے صاحبان کو سانپ تو نہیں سونگھ گیا ہوگا کہ وہ گھر میں چپ سادھے آسمان کی طرف

ٹکٹکی لگائے بیٹھے رہے ہوں۔ اقتدار سے وفاداری یا 'انسانیت' بھی تو کوئی چیز ہے۔

میں یہ نہیں جانتا کہ پیر علی محمد راشدی کو محقق کہوں، سیاست کہوں، ادیب کہوں، دانشور کہوں یا شاعر لکھوں۔ لیکن پاکستان کی تاریخ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک کمال ہوشیار انسان تھے۔ وہ آمروں کی حمایت کرتے تھے اور جمہوری اداروں کے ساتھ بھی ہوتے تھے۔ صحافیوں اور ادیبوں کے لیے بھی بہت ہمدردی رکھتے تھے اور ادب کے فروغ کے لیے بھی انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کی کتاب ''اھی ڈینھن اھی شینھن'' (وہ دن وہ لوگ)، ''رودادِ چمن'' اور اس کے علاوہ بے شمار مضامین جو انھوں نے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بارے میں لکھے، ان مضامین کے حوالے آج بھی دیے جاتے ہیں۔ لیکن تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ پیر پگارا سید صبغت اللہ شاہ کو سزائے موت دلوانے میں انھوں نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا، ایوب خان کو بادشاہت قائم کرنے کا مشورہ دیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو ایک خودساختہ حزبِ اختلاف بنانے کی بھی تجویز دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابوں میں تاریخ کے ایسے گوشے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا سایہ بھی ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ علی محمد راشدی دانش ور تھے، ادیب تھے، تاریخ دان تھے۔ لیکن یہ سوال بہرحال اپنی جگہ ہے کہ ان کے یہ گراں قدر مشورے کیا سیاست کے زمرے میں آتے ہیں یا سازش کے۔

❀

لازمی سروس ایکٹ اور ملّو مہارانی

جس وقت میں نے ملّو مہارانی کو دیکھا تو اس وقت ان کی عمر کم از کم 85 برس ہوگی۔ میں یہ سطور 3 سال بعد لکھ رہا ہوں۔ وہ ایک ریاست کی مہارانی ہیں۔

مہارانی کیوں ہیں، اس کا جواب بہت ہی آسان ہے کہ ملّو مسلمان نہیں، ہندو ہیں اور اُن کی بہو اُن کی ولی عہد۔ ولی عہد اس لیے کہ ملّو کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی شادی اُنھوں نے بڑے پیار سے رچائی تھی۔ بیٹا بھری جوانی میں چار بچے پیدا کر کے آنجہانی ہوگیا۔ بچے چھوٹے تھے، اس لیے وہ ریاست کی صحیح طریقے سے دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ملّو نے اپنی بہو کو ریاست کے معاملات کی نگرانی کا کام سونپ دیا۔

ملّو مہارانی ریاستی امور کو سلجھانے کے لیے صبح سویرے ریاست کے دارالحکومت میں اپنی بہو کے ہمراہ پہنچ جاتی تھیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ریاستی خزانے میں سے کوئی چیز بھی باہر نہ جائے اور کوئی 'گھس بیٹھیا' ریاست کے معاملات میں مداخلت نہ کر سکے۔

ملو ایسے تمام لوگوں کو اپنی جادوئی چھڑی کے ذریعے دارالحکومت سے دور رکھتیں۔ دارالحکومت کے آس پاس رہنے والوں میں سے اکثر لوگوں کو ریاست کے قواعد و ضوابط کا بخوبی علم تھا، اس لیے ان کی جانب سے کبھی بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی، لیکن کبھی کبھار بیرونی حملہ آور اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتے تھے جن میں سے اکثر افغانستان کے لوگ ہوتے تھے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں جب ریاستیں

اور راجواڑے ختم ہو گئے تو ملّو کی ریاست کہاں سے سے آئی؟ کہاں ہے؟ کس جگہ پر ہے؟ اس کا جواب یوں ہے کہ یہ ریاست بندر روڈ کے قریب عیدگاہ میٹرنٹی ہوم سے منسلک ہے۔ یہ ایک کچرا کنڈی ہے اور ملّو اور اس کی بہو اس کچرا کنڈی کی تن تنہا مالکن ہیں۔

ملّو اب بہت علیل ہے، اس لیے وہ اب وہاں نظر نہیں آتی۔ اب اس کچرا کنڈی پر گھس بیٹھیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہاں سے اپنی ضرورت کی چیزیں چنتے ہیں اور لے جاتے ہیں۔

ویسے تو ہم میں سے زیادہ تر لوگ لاشعوری طور پر اس چیز سے واقف ہوتے ہیں، لیکن جب سے میں نے ملو مہارانی کو دیکھا ہے، تب سے میں ایک بات پر بار بار غور کرتا ہوں مگر سمجھنے سے قاصر ہوں، کہ کراچی کی گندگی اور غلاظت صاف کرنے والے صرف غیر مسلم، خصوصاً ہندو اور مسیحی ہی کیوں ہیں؟

گزشتہ دنوں پی آئی اے کے ملازمین اور حکومتِ وقت کے درمیان نجکاری کے مسئلے پر پیدا ہونے والے تنازع نے طول کھینچا تو حکومت نے ہڑتال ختم کرنے کے لیے لازمی خدمات کا قانون نافذ کر دیا۔ اس ایکٹ کے تحت پی آئی اے کا کوئی بھی ملازم حکومتی اقدامات کی مخالفت کرے گا تو وہ ملازمت سے فارغ کر دیا جائے گا۔

یہ قانون 1952ء میں بنا تھا۔ اس کی شق نمبر 4 میں لکھا ہے کہ اس قانون کی زد میں آنے والا کوئی بھی سرکاری ملازم قانون کی حد میں آنے والے علاقے سے نقل مکانی نہیں کر سکتا۔

اس قانون پر اظہار خیال پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر سری پرکاش نے اپنی کتاب ''پاکستان — قیام اور ابتدائی حالات'' میں کیا ہے۔ وہ کتاب کے صفحہ نمبر 71 پر لکھتے ہیں کہ:

سندھی ہندوؤں کی ہجرت کے بارے میں چند خاص باتیں، چاہے وہ کتنی ہی پُر ہول کیوں نہ ہوں، بتا دینا ضروری ہے۔ اتر پردیش، بالخصوص اس کے مشرقی اضلاع سے ہمیشہ سے لوگ بڑی تعداد میں تلاشِ روزگار میں پچھمی (مغربی) ہندوستان جاتے رہے ہیں — سلطان پور، کان پور، غازی پور، بنارس اور دوسرے اضلاع سے ہزاروں افراد احمد آباد، بمبئی اور دوسرے شہروں میں

جاتے رہتے تھے، جہاں وہ کارخانوں اور دوسرے اداروں میں کام کرتے تھے۔ اُن کو سال میں ایک ماہ کی رخصت ملتی تھی۔ تب وہ اپنے اپنے گھر آ کر بال بچوں میں چھٹیاں گزارتے تھے۔

یہ لوگ خود تو دور دراز شہروں میں تکلیف سے اپنے دن گزارتے تھے اور اُن کے اہل و عیال اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ اپنی کمائی سے جو کچھ بچا سکتے تھے، گھر بھیجتے تا کہ لگان اور مہاجن کے قرض ادا کر دیے جائیں اور خاندانی جائیداد محفوظ رہے۔ کراچی میں بھی ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی۔

تقسیم کے بعد جب ہندو گھر بار چھوڑ کر ہندوستان جانے کی تیاری کر رہے تھے تو ''اہم خدمات کا قانون'' نافذ کر دیا گیا کہ کوئی مزدور، سرکاری ملازمین کے ذاتی خدمت گار اور اسی نوعیت کے دوسرے لوگ ملک سے باہر نہیں جا سکتے۔ مجھے اس حکم سے سخت صدمہ پہنچا۔ میں نے وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خان سے جا کر کہا کہ قدیم رواج کے مطابق یہ لوگ سال میں ایک مہینہ گھر پر گزارتے تھے، اب اس کی اجازت ان کو نہ دینا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ نواب زادہ نے جواب دیا کہ سال ہائے پیوستہ میں چھٹی ختم ہونے پر لوگ واپس آ جاتے تھے، مگر اب یہ گئے تو یہاں پلٹ کر نہ آئیں گے۔ اسی وجہ سے گھر جانے کی چھٹی جو اُن کو ملا کرتی تھی، منسوخ کر دی گئی ہے۔

میں نے کہا کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے وطن جانا چاہتا ہے تو اُس کے جانے کی ممانعت کیوں کی جائے اور اُس سے یہاں جبراً کیوں کام لیا جائے، خود آپ بھی تو ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی ہمدردی تو انہی لوگوں کے ساتھ ہونی چاہیے۔

نواب زادہ نے کہا کہ اگر یہ افراد واپس نہ آئے تو سڑکوں اور بیت الخلاؤں کی صفائی کون کرے گا؟ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کہ خدا نے اُتر پردیش کے ہندوؤں کو کراچی کی سڑکیں اور بیت الخلاء صاف کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا، کم از کم آپ کو تو اس ظلم و ناانصافی کی تائید نہیں کرنی چاہیے، لیکن میری کون سنتا؟

میں نے وزیر اعظم ہندوستان کو ان حالات سے آگاہ کیا اور اُنھوں نے وزیر اعظم پاکستان

سے مراسلت بھی کی، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میں ان میں سے جتنوں کو بھی ہندوستان بھیج سکا، روانہ کردیا، باقی ماندہ پر کیا گزری، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔

یہ کوئی ایک ہی کہانی نہیں بلکہ اس طرح کی بے شمار داستانیں ہیں مگر ان داستانوں کو بیان کرنے کے لیے بہت زیادہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ ہمیں پاکستان کی سیاست، تاریخ اور خصوصاً متحدہ ہندوستان کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی ہم کسی ایک ایسے مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں یہ معلوم کیا جاسکے کہ آخر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں وہ کیا چیزیں تھیں جن سے ہم نے صرفِ نظر کیا اور وہ ہمارے مطالعے سے محو ہوگئیں۔

عین ممکن ہے کہ ملّو بائی اور اُس کا خاندان بھی مذکورہ بالا قانون کی زد میں آگیا ہو۔ اگر ہم تاریخِ عالم کا مطالعہ کریں تو ہجرت کرنے والوں میں امیر لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے کیونکہ اُن کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ اپنی جائیداد اور محلات چھوڑ کر صرف قربانی کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنے وطن سے ہجرت کریں۔ ہجرت کا یہ عمل عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو کس مپرسی شکار ہوتے ہیں۔

شری پرکاش نے ہجرتوں سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ ''سندھ کے ہندو تارکینِ وطن کے مصائب'' کے عنوان کے تحت اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 73 پر ہندو اشرافیہ کی پاکستان سے ہجرت کی وجہ بہت ہی دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> اس دردناک فضا میں یہ چیز قابلِ احترام ہے کہ اعلیٰ طبقے کے سندھی ہندو اپنے گھریلو کاموں میں اترپردیش کے نوکروں اور باورچیوں کے دستِ نگر تھے۔ ایک کانگریس کے کارکن سے جو سوسائٹی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، میں نے کہا کہ آپ نہ جایئے، بلکہ یہیں رہ کر سندھ کے ہندوؤں کی رہنمائی اپنے ذمے لے کر اُن کی حفاظت کیجیے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب میرے تمام ملازمین جارہے ہیں تو میں کیسے رہ سکتا ہوں؟ آخر میرا کھانا کون پکائے گا؟ میں نے پوچھا کہ آپ کی خواتین کھانا پکانا نہیں جانتی ہیں؟ اس سوال پر انھیں ایک اچنبھا سا ہوا اور خشم آلود لہجے میں کہا کہ

کیا آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ ہماری خواتین کھانا پکائیں؟

اس اقتباس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ نواب زادہ لیاقت علی خان کا مؤقف اپنی جگہ درست تھا، چاہے اخلاقی طور پر درست ہو یا نہ ہو۔ جب کسی ریاست کے چھوٹے کام کرنے والے لوگ اچانک چلے جائیں اور وہ ایک ایسا خلا پیدا کر جائیں جو پُر کرنا آسان نہ ہو تو پھر انھیں روکنے کے لیے آپ کو 'لازمی خدمات'' کا قانون ہی نافذ کرنا پڑے گا۔ اب یہ پی آئی اے کے ملازم ہوں، میونسپلٹی کے خاکروب یا کوئی اور۔

اس پورے واقعے سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نظریہء ہجرت جداگانہ تھا، مگر دونوں ہی طرف کے غرباء اور نچلے طبقے کے لوگوں کو ہجرت کرنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ایک طرف قتلِ عام اور غیر قانونی ذرائع سے، تو دوسری طرف ایک 'ایکٹ' نافذ کرکے۔

❋

اُدھوداس کی گردن زنی

موضوع پڑھتے ہی آپ کے دل میں یہ گمان پیدا ہوگا کہ شاید کوئی ہندو مذہبی انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ایسا ہے بھی اور نہیں بھی کیونکہ جب اُدھوداس کی گردن ماری گئی وہ زندہ نہیں تھا۔

اگر وہ زندہ نہیں تھا تو گردن کیسے اُڑائی گئی؟ جواب یہ ہے کہ سر قلم تو ہوا لیکن زندہ اُدھوداس کا نہیں بلکہ ان کے سنگ مرمر کے مجسمے کا۔ اس کے باوجود وہ آج تک لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ 1979 میں گردن مارے جانے کے 36 اور 19 جنوری 1943 کو اُدھوداس کے انتقال کے ٹھیک 73 برس بعد شکارپور کے ہندو اور مسلمانوں نے رائے بہادر کے شکارپور میں قائم ہسپتال میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلسے کے شرکاء میں ہندو کم مسلمان زیادہ تھے۔

آخر رائے بہادر اُدھوداس کون تھے؟ رائے بہادر اُدھوداس شکارپور کے ایک معروف تاجر تھے، جنھوں نے شکارپور میں اپنی مدد آپ کے تحت تقسیم ہند سے قبل 1933 میں شہریوں کے لیے ایک اسپتال کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کے لیے ذاتی طور پر ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ اس وقت کے ایک لاکھ روپے کی مالیت اب کیا ہوگی یہ کوئی ماہر معاشیات ہی بتا سکتا ہے۔

اُدھوداس کے دل میں یہ خیال کیوں آیا، اس بارے میں شکارپور سے تعلق رکھنے والے کالم نگار نسیم بخاری 20 جنوری 2016 کو سندھی روزنامے عبرت میں شائع ہونے والے اپنے کالم ''آیئے ایک محسن کو یاد کریں'' میں لکھتے ہیں کہ:

ایک بار رائے بہادر کی والدہ بیمار ہوگئیں۔ شکارپور میں علاج کی مناسب سہولتیں

میسر نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شکار پور میں ایک اچھا اسپتال ہونا چاہیے، اسی بنا پر انھوں نے شکار پور ہسپتال کی تعمیر کا ڈول ڈالا۔

اسپتال کی تعمیر کے پس منظر میں ایک ہی جذبہ کارفرما تھا اور وہ تھا انسان دوستی کا۔ معروف دانش ور ڈاکٹر انور فگار کے مطابق یہی وجہ تھی کہ 30 اپریل 1933 میں اسپتال کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد اسپتال کی تعمیر و ترقی میں انھوں نے اپنا تن من دھن سب وقف کر دیا۔ ایک طرف تو تقسیم ہند کے معاملات عروج پر تھے تو دوسری جانب اُدھوداس اسپتال کے لیے سندھ میں انھیں چندے کے حصول میں دشواری کا سامنا تھا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اپنا رخ بمبئی کی جانب کیا اور وہیں چل بسے۔ اپنے اسپتال کے لیے چندہ جمع کرنے والے اُدھوداس کی موت ان جیسے کسی اور سماجی کارکن کے نام سے منسوب اسپتال میں ہوئی۔ اُدھوداس اسپتال شکار پور کے باہر انگریزی میں دو اور سندھی میں ایک آویزاں تختیوں پر ایک سا ہی مضمون درج ہے۔ جس کا متن یوں ہے:

سرگ واسی، رائے بہادر اُدھوداس تاراچند 73 برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس قربانی کے مجسمے نے شکار پور میں اپنے ہسپتال روپی مندر پر اپنی جان قربان کی۔ صاحب اس ہسپتال کے لیے چندہ جمع کرنے بمبئی گئے، جہاں طویل جدوجہد اور جاں فشانی کے باعث بیمار ہو گئے اس لیے انھیں سر ہری کشن ہسپتال علاج کے لیے منتقل کیا گیا۔ جہاں 17 جنوری 1943 کو وہ یہ جہاں چھوڑ گئے۔

اُدھوداس کے اس نیک کام میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی شریک تھے گو کہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ان مسلمانوں میں نمایاں نام لیڈی نصرت حاجی عبداللہ ہارون کا ہے جنھوں نے اسپتال کے لیے 7000 روپے کا چندہ دیا۔ خان بہادر عبدالستار آف کوئٹہ نے ایک ہزار روپے، حاجی مہر بخش مولا بخش اینڈ سنز کراچی والا نے پانچ سو روپے کا عطیہ دیا۔ لیڈی نصرت حاجی عبداللہ ہارون کے نام سے اسپتال کے داخلی دروازے کے دائیں جانب ایک قدیم عمارت موجود تھی۔ یہ عمارت میں نے دیکھی تھی لیکن اب اس عمارت کو مسمار کر دیا گیا ہے۔

آیئے اب ذکر کرتے ہیں اُدھوداس کے مجسمے کا۔

یہ مجسمہ سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا جوان کی خدمات کے صلے میں ہسپتال کے بیرونی دروازے کے چبوترے پر لگایا گیا تھا۔ صحافی اور سماجی حقوق کے علمبردار ضمیر اعوان کے مطابق مجسمے کو سب سے پہلے اس وقت نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی جب مسجد منزل گاہ کا واقعہ شروع ہوا۔ شرپسندوں کی نظریں اُدھوداس کے مجسمے پر تھیں کہ کسی بھی طرح اس مجسمے کو زمین بوس کیا جائے، اس لیے مجسمے کو سفید رنگ کے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔

تقسیم ہند کے بعد اس مجسمے پر وقتاً فوقتاً کئی حملے ہوتے رہے۔ حملہ آوروں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی بھی طرح مجسمے کے ناک کان کاٹے جائیں، لیکن اس میں انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ مجسمے کو مسمار کرنے کا آخری حملہ 1979 میں ہوا۔ شکار پور کے مقامی صحافی زاہد نون کے مطابق مذہبی تنظیم جماعت اسلامی کی جانب سے شکار پور میں ایک ریلی منعقد کی گئی۔ ریلی کے شرکاء کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے آہنی اوزار تھے ان افراد نے مجسمے پر ہلا بول دیا اور بالآخر مجسمے کو گرا کر دم لیا۔

بعدازاں یہ مجسمہ غائب ہو گیا لیکن اب یہ سندھالوجی ڈپارٹمنٹ سندھ یونیورسٹی جامشورو میں موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مجسمہ وہاں کب، کیوں اور کیسے پہنچا۔ اس بارے میں معلومات کے لیے ہم نے ڈپارٹمنٹ کے سابق چیئرمین محمد قاسم ماکا سے رابطہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ مجسمہ ڈاکٹر غلام علی الانا کے دور میں لایا گیا تھا، بہتر ہے کہ ان سے بات کی جائے۔ جب ڈاکٹر غلام علی الانا کو بتایا کہ ہم رائے بہادر ادھوداس کے مجسمے کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مجسمے کی سندھالوجی منتقلی کی کہانی یوں بیان کی:

''یہ غالباً 81-1980 کی بات ہے، مجھے شکار پور سے کسی صاحب نے فون کیا۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں لیکن وہ ذات کے آغا تھے۔ انھوں نے بتایا کہ شکار پور کے اسپتال کے باہر اُدھوداس کے مجسمے پر ایک مذہبی تنظیم کے لوگوں نے حملہ کر کے اس کی گردن اُڑا دی ہے اور ہاتھ پیر توڑ دیے ہیں، برائے مہربانی اس مجسمے کو سندھالوجی منتقل کر کے اس کی اصل شکل میں بحال کریں۔''

میں نے محکمے کے کچھ دوستوں کے تعاون سے مجسمے کو، جو بہت ہی شکستہ حالت میں تھا،

سندھالوجی منتقل کر دیا۔ منتقل کرنے کے بعد بھی مجھے ایک خوف یہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ اس مجسمے پر سندھالوجی میں بھی حملہ ہو جائے۔ ہم نے مجسمے کو روشن شاہ راشدی میوزیم میں ایک دروازے کے پیچھے رکھ کر کپڑے سے ڈھانپ دیا تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ پائے۔

جب بھی میوزیم میں کوئی پروگرام ہوتا تھا تو ہم خاصے محتاط ہوتے تھے کہ کوئی اس طرف نہ جا پائے۔ ایک بار معروف قانون دان اے کے بروہی سندھالوجی کے دورے پر تشریف لائے۔ بروہی کے ضیاء الحق سے خصوصی مراسم تھے۔ یہ 1980 کی بات ہے۔ ہم نے ان کو میوزیم کا دورہ کروایا اور پوری کوشش کی کہ کپڑے سے ڈھکا مجسمہ ان کو نظر نہ آئے لیکن قسمت نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔ بروہی کی نظر کپڑے سے ڈھکے مجسمے پر پڑ گئی۔ وہ مجھ سے بولے یہ کیا چھپایا ہے؟ مجھے دکھاؤ۔

میں نے کہا آپ سے اور مذہبی جماعتوں سے ڈر لگتا ہے۔ انھوں نے کہا میں ہر صورت میں دیکھنا چاہوں گا۔ مجبوراً مجسمے سے کپڑا اٹھایا گیا۔ وہ مجسمے کی حالت دیکھ کر خاصے رنجیدہ ہوئے اور بولے یہ تو اُدھو داس ہے۔ یہ تو بہت عظیم انسان تھے۔ ان کے مجسمے کو جلد از جلد اصلی شکل میں بحال کرو۔ اس کے اخراجات میں ادا کروں گا۔ ان کے اس فرمان کے بعد ہم نے مجسمے کی بحالی کی ذمہ داری عظیم چانڈیو اور علی نواز پھلپوٹو کو سونپ دی۔

ایک اور اہم بات یہ کہ ضیاء الحق کے دور میں سندھ کے ایک صوبائی وزیر صحت احد یوسف جو میری بڑی عزت کرتے تھے مجھ سے ملنے آئے اور کہا آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔ احد یوسف نے بتایا کہ مذہبی تنظیموں کی جانب سے ان پر دباؤ ہے کہ رائے بہادر اُدھو داس اسپتال کا نام تبدیل کیا جائے۔

غلام علی الانا کے مطابق ''مجھ پر ایک لمحے کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے احد یوسف سے کہا ایک شخص جس نے اسپتال کی تعمیر کے لیے اپنی جان قربان کی، اب اس کے نام سے منسوب اسپتال کا نام بھی بدلا جائے گا۔ تمھارے پاس اختیار ہے تم یہ کر سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھو تاریخ میں تمھیں کبھی اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا جائے گا۔'' احد یوسف خاموشی سے چلے گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ میری گفتگو تھی یا کوئی اور وجہ، احد یوسف نے اسپتال کا نام تبدیل نہیں کیا۔

اب ہمیں تلاش تھی عظیم چانڈیو صاحب کی۔ ان کا نمبر غلام علی الانا صاحب کے پاس نہ تھا۔ انھوں نے ہماری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ وہ کراچی میں رہتے ہیں، شاید محکمہ ثقافت والوں کو ان کے بارے میں معلوم ہو۔ ہم نے محکمہ ثقافت سے وابستہ محمد علی قادری سے رابطہ کیا تو انھوں نے عظیم چانڈیو صاحب کے بھتیجے جمیل چانڈیو کا نمبر دیا، اور بالآخر جمیل کے ذریعے عظیم چانڈیو صاحب سے رابطہ ہوا۔ چانڈیو صاحب نے مجسمے کی منتقلی کی کہانی یوں بتائی:

> جب میں مجسمے کی باقیات کے حصول کے لیے شکارپور پہنچا تو کوئی یہ بتانے کو تیار نہ تھا کہ رائے بہادر کا مفتوحہ مجسمہ کہاں ہے۔ ہسپتال سے نکل کر میں میونسپل کمیٹی کے دفتر پہنچا۔ وہاں بھی معلومات حاصل کرنا بے سود رہا۔ اس دوران میں نے ایک بات نوٹ کی کہ میونسپل کمیٹی ملازمین کے مجھے ایک حصے میں جانے سے روک رہے ہیں۔ میں نے اصرار کیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے مجھے وہاں لے گئے، لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ملازمین ایک کمرے کے سامنے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ کمرہ میری نظروں سے اوجھل رہے۔ لیکن میں نے ان سے پوچھا کہ اس کمرے میں کیا ہے؟ انھوں نے مجھے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ کاٹھ کباڑ کے لیے ہے۔ میں نے اسے کھولنے پر اصرار کیا۔ بادلِ ناخواستہ انھوں نے کمرہ کھولا۔ کمرے میں کاٹھ کباڑ تو نہیں تھا، لیکن ایک کے بجائے دو مجسمے تھے (دوسرے مجسمے کا ذکر شکارپور کی اگلی کہانی میں کریں گے)۔ یہ مجسمے بہت شکستہ حالت میں تھے۔ کسی کی گردن الگ تھی تو کسی کا ہاتھ یا پیر۔ لیکن دونوں مجسموں میں ایک بات مشترک تھی ان کے ناک اور کان کٹے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر کالک ملی ہوئی تھی۔

''خیر میں یہ مجسمے لے کر جامشورو آ گیا۔ اگلا مرحلہ اُدھو داس کے مجسمے کی بحالی کا تھا۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا لیکن مجھے ہر صورت کرنا تھا۔ سب سے پہلے میں نے مجسمے کا پورا ناپ لے کر ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی تعداد لکھی۔ دوسرا مرحلہ اس کیمیکل کا حصول تھا جس کی مدد سے مجسمے پر خصوصاً چہرے پر تارکول اور دیگر محلولوں کے ذریعے جو کالک ملی گئی تھی اسے صاف کیا جائے۔ میں

نے یہ تمام چیزیں جمع کرنے کے بعد مجسمے کی بحالی کے کام کا آغاز کیا۔ مجھے سب سے زیادہ مشکل اس کے ناک اور کان جوڑنے میں پیش آئی۔ یہ اتنی صفائی اور جذبہ ایمانی سے کاٹے گئے تھے کہ بڑی مشکل سے جڑ پائے۔''

جب ہم نے عظیم چانڈیو صاحب کو بتایا کہ مجسمے کے ایک ہاتھ میں تو کوئی دستاویز ہے لیکن دوسرا ہاتھ کلائی سے الگ ہے، تو انھوں نے بتایا کہ اُدھوداس کے ایک ہاتھ میں جو دستاویز ہے وہ رائے بہادر کا اعزاز ملنے کی سند ہے۔ جہاں تک دوسرا ہاتھ کلائی سے غائب ہونے کا تعلق ہے تو جب انھوں نے مجسمہ بحال کیا تھا تو اس کی صرف ایک انگلی ٹوٹی ہوئی تھی، کلائی کیسے غائب ہوئی، شاید ایک بار پھر کسی نے جذبہ ایمانی سے مغلوب ہو کر توڑ دی ہوگی۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ مجسمے کی سندھ حالوجی میں منتقلی کی صحیح تاریخ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے دوست ذوالفقار ہالیپوٹو نے ہماری مدد کی اور سندھ حالوجی کے موجودہ چیئرمین سعید منگی کا نمبر دیا۔ سعید منگی نے رابطہ کرنے پر ہمیں بتایا کہ ادھوداس کا مجسمہ 20 مارچ 1980 کو سندھ حالوجی منتقل کیا گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ رائے بہادر بہت زیرک اور باشعور شخص تھے۔ غالباً ان کی چھٹی حس نے انھیں آگاہ کر دیا تھا کہ مستقبل میں ان کے مجسمے کے ساتھ کیا ہوگا۔ انھوں نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا کہ اسپتال میں آنے والے مریض جب ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں، تو انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جن سیڑھیوں پر پیر رکھتے ہوئے اسپتال میں داخل ہوتے ہیں وہاں رائے بہادر ادھوداس کا نام لکھا ہوا ہے۔

مذہبی جماعت والوں نے رائے بہادر کا مجسمہ تو گرا دیا لیکن زمین پر لکھا ہوا نام رہنے دیا۔ ہندو کا نام اگر پیروں تلے آ رہا ہے تو کیا مضائقہ ہے، بس اس کا مجسمہ نہیں ہونا چاہیے۔ دواؤں کی ایک کمپنی نے ہسپتال کو کچھ اور دیا ہو یا نہ دیا ہو، لیکن اندرونی دروازے کے اوپر کلمہ طیبہ کا بورڈ لگا کر کمپنی کا نام لکھ دیا ہے۔ اس تختی کے اوپر ادھوداس کے اپنے سندھی اشعار تحریر ہیں، جن کا اردو میں ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے:

سب کے دکھ دور کر، سب کا کر کلیان

آہیں دکھیوں کی سن کر رب ہوا مہربان

معاف کر میرے مالک، عیب بھرا انسان

عرض ادھو کی سن، دے تندرستی دان

ہسپتال پر لگی تختیاں حالات کی دھند میں دھندلی ہوتی جا رہی ہیں۔ رائے بہادر ادھو داس کا مجسمہ جس چبوترے پر نصب تھا، اس کے نیچے سندھی میں ان کے یہ اشعار درج ہیں:

''دُکھی بیمار آتے ہیں، سکھی ہو کر گھر جاتے ہیں

روتے چلاتے آتے ہیں، دعائیں کرتے جاتے ہیں

پجاری بن کر میں بیٹھوں، اسی مندر کی سیڑھی پر

دُکھی بیمار جو آئیں، بٹھاؤں ان کو آنکھوں پر۔''

واقعی اُدھو داس مندر کی سیڑھی پر پجاری بن کر بیٹھے ہیں۔ اسپتال میں آنے والا ہر مریض اور تیمار داران کے نام پر پیر رکھتے ہوئے ہسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن اب شکار پور کے ہندو باسیوں اور ان کی سماجی تنظیموں نے اپنا طریق کار بدل لیا ہے۔ شکار پور کے ایک مندر میں چیزیں دان کرنے والوں کے نام زمین پر نہیں آسمان پر لکھے ہوئے ہیں۔ آسمان کا سن کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس مندر کی چھت پر جو پنکھے لگائے گئے ہیں، دان کرنے والوں کے نام ان پر لکھ دیے گئے ہیں۔

بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے

❊

کراچی کا یہودی قبرستان اور نامعلوم فون کال

میں پاکستان میں رہنے والے یہودیوں کے لیے کچھ کر تو نہیں سکتا، خصوصاً ان کے قبرستانوں کے لیے، ہاں مگر جس طرح کبھی مذہبی برادریوں اور قومیتوں میں موجود دلچسپ چیزوں اور ان کے تاریخی مقامات کے بارے میں لکھتا رہتا ہوں، ویسے ہی ان کے بارے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔

اگر آپ ہمارے مستقل قاری ہیں تو آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصے قبل ہم نے یہودیوں کی مسجد اور قبرستان کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کے بعد فیس بک پر ایک پاکستانی یہودی نوجوان نے ہمیں ایک طویل فہرست ارسال کی جس میں کراچی میں بسنے والے یہودیوں کے نام تھے اور وہ ان کی بابت جاننا چاہتے تھے، خصوصاً ان کی قبروں کے کتبوں کے بارے میں۔

ہم نے اس سے صرفِ نظر کیا کیونکہ ہمارا کام لکھنا ہے اور نشان دہی کرنا ہے، باقی کام ضروری نہیں کہ ہم ہی کریں۔ یہ ایک مذہبی، سماجی اور تاریخی ورثے کا معاملہ ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ادارے موجود ہیں، لیکن یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ یہودیوں کے قبرستان کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

خیر بات آئی گئی ہوگئی، لیکن ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب ہمیں ایک اجنبی نمبر سے ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ ایک طویل عرصے سے انسانی حقوق کمیشن پاکستان سے وابستگی کی بنا پر ان جان نمبرز سے اکثر فون موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنا ایک اصول بنالیا ہے کہ معلوم نمبر سے آنے والی کال اٹینڈ کریں یا نہ کریں لیکن نامعلوم نمبر سے آنے والی کال ضرور اٹینڈ کرتے ہیں اور اٹینڈ نہ کر پائیں تو جوابی کال ضرور کرتے ہیں۔ کچھ عرصے قبل ہمیں ایک کال

موصول ہوئی۔ نمبر خاصا طویل تھا لہٰذا یقیناً یہ پاکستان کا نمبر نہیں تھا۔ فون پر گفتگو یوں ہوئی۔

س: کیسے ہیں؟

ج: جی ٹھیک ہوں، مگر آپ کون؟

س: ارے اختر بھائی میں ’ع‘۔

ج: ’ع‘ کون؟

س: حضور آپ کا یونیورسٹی میں جونیئر تھا۔

ہم: ہاں یاد آیا ... بولو خیر تو ہے؟

ع: یار وہ آپ نے یہودیوں کے قبرستان اور مسجد پر کچھ لکھا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قبرستان کی صورت حال خاصی خراب ہے۔

ہم: ہاں ہاں

ع: تو کیا اس قبرستان میں جھاڑیوں وغیرہ کی صفائی ہو سکتی ہے؟

ہم: کیوں نہیں۔

ع: تو آپ یہ کروا سکتے ہیں؟

ہم: میں کیسے کرواؤں؟

ع: یار اختر بھائی کوشش تو کریں۔ پیسے آپ کو مل جائیں گے۔ باقی کام آپ خود کروالیں۔

ہم: میں قبرستان کی نگران خاتون کے بیٹے کا نمبر بھیج دوں گا، اس سے بات کرو۔ وہ یہ کام کر دے گا۔

ع: آپ نہیں کریں گے؟

ہم: یار سمجھا کرو، میں نہیں کر سکتا۔ ویسے ایک بات بتاؤ اس قبرستان میں تمھاری دلچسپی کیا؟

ع: (زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے) اختر بھائی ویسے تو لوگ تمھیں بہت ہی ہوشیار مؤرخ سمجھتے ہیں جو سندھ اور خصوصاً کراچی میں بسنے والے غیر مسلموں کے بارے میں نا صرف تحقیق کرتا ہے بلکہ لکھتا بھی ہے، اور آپ کو میرا پتا ہی نہیں۔

ہم: نہیں نہیں کچھ تو بتاؤ؟

ع: بھائی میں اور میرا ننھیال یہودی ہیں۔ میری نانی اسرائیل منتقل ہونے سے قبل آخری یہودی خاتون تھیں جو اس قبرستان کا خیال رکھتی تھیں۔ اگر یقین نہ آئے تو قبرستان کی نگران خاتون سے پوچھ لینا اور ہاں ایک قبرستان اور بھی ہے یہودیوں کا کراچی میں، وہ بھی ڈھونڈ نکالو تو پھر مزہ آئے گا۔

ہم: یہ تو میں کرلوں گا لیکن یار بات ہضم نہیں ہو رہی۔

ع: اختر بھائی آپ تو ریسرچ کے آدمی ہیں، ڈھونڈو گے تو مل ہی جائے گا۔ اچھا کم از کم اتنا تو کر دیں کہ کچھ قبروں کی تصویریں بھیج دیں تا کہ میں اپنی کمیونٹی کے ساتھ شیئر کرسکوں، شاید ان قبروں میں ان کے پیاروں کی قبریں ہوں۔ اگر وہ پاکستان نہیں آسکتے تو کیا ہوا کم از کم ان کے کسی رشتے دار کے کتبے کی تصویر ان کے لیے ایک یادگار ہوگی جسے وہ محفوظ کر سکتے ہیں۔''

ابھی کچھ دن قبل یہودی قبرستان جانے کا موقع مل گیا تھا، لیکن وقت کم تھا چنانچہ میں نے کچھ قبروں کے کتبوں کی تصویریں بنالیں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ اور ہاں میں ایک اور یہودی قبرستان بھی گیا تھا لیکن اس میں قبروں کے کتبے نہیں ہیں۔ اس قبرستان کا ذکر پھر کسی وقت کریں گے۔ فی الحال یہودیوں کے قبرستان کی حالت اور وہاں کی قبروں پر لگے کتبوں کی بات کرتے ہیں۔

یہودیوں کی قبروں پر لگے ہوئے کتبوں کے بارے میں ایک دلچسپ بات ہمیں ہمارے بھتیجے محسن سومرو نے بتائی کہ ان کتبوں پر صرف عمر نہیں لکھی ہوئی ہوتی بلکہ مہینے اور دن بھی لکھے ہوتے ہیں۔ یہ ایک اور دلچسپ چیز تھی۔ مثلاً ایک کتبے پر تحریر ہے کہ:

موزس سولومن میدھیکر

سنِ پیدائش 12 نومبر 1855

عمر 70 سال 11 مہینے 5 دن

انتقال 17 اکتوبر 1926

یہودیوں کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ صرف کراچی تک محدود تھے، لیکن یہودی قبرستان کے ایک کتبے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ کراچی کے علاوہ سندھ کے دیگر شہروں میں بھی خدمات انجام دیتے تھے۔ ایک قبر حیدرآباد کے سول ہسپتال میں خدمات انجام دینے والے ڈاکٹر ایلیزر جیکب بھورا ایکر کی بھی ہے، جن کا سالِ پیدائش 1850 اور وفات 1922 کی ہے۔ اسی طرح سے ایک قبر کراچی کی یہودی برادری کے نائب صدر ابراہام ریو بن کمارلیکر کی ہے۔

پاکستان میں یہودیوں کی موجودگی اور پھر اچانک پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے سلسلے میں بہت سی کہانیاں گردش میں رہی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہودیوں کی پاکستان میں موجودگی کے معاملے کو شہرت ڈان میں شائع ہونے والے ہمارے بلاگ ''کراچی کی یہودی مسجد'' سے حاصل ہوئی۔

ہم نے پوری کوشش کی تھی کہ کراچی میں یہودیوں کے قبرستان اور ان کی آبادی کے بارے میں مکمل معلومات دیں۔ ہم اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ لیکن بلاگ چھپنے کے تقریباً دو سال بعد مختلف ٹی وی چینلوں نے یہودی قبرستان کی کراچی میں موجودگی سے متعلق ''انکشافات'' شروع کر دیے۔ لیکن صاحب بات وہی ہے 90 سیکنڈ کی اسٹوری میں 1866 سے 1951 تک کی تقریباً 90 برسوں کی تاریخ کو نہیں سمیٹا جا سکتا، اور اس برادری کی تقسیم سے پہلے اور بعد کراچی میں موجودگی، یہاں ان کا رہن سہن اور ان کے یہاں سے جانے کے واقعات نہایت تحقیق طلب ہیں، جن پر بات کرنے میں شاید ہی کسی کو دلچسپی ہے۔

*

مَرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہماری اس تحریر کا موضوع غالب کی ایک خواہش پر ہے جو مذہبی رواداری کی ایک خوبصورت اور اعلیٰ دلیل ہے۔ غالب برہمن کو کعبے میں دفنانا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی اور اب ممکن بھی نہیں، کیونکہ برہمن تو کیا اب کوئی اہلِ کتاب بھی کعبے میں داخل نہیں ہوسکتا، وہاں دفن ہونا تو دور کی بات ہے۔

میر پور خاص کے لُنڈ بلوچوں نے غالب کو پڑھا ہو یا نہ ہو لیکن غالب کی خواہش کے مطابق ایک برہمن کو کعبے میں نہ سہی اپنے امام باڑے میں دفن کر دیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ برہمن اس وقت تک مسلمان ہو چکا تھا، مگر اس کے باوجود علاقے میں بسنے والے دیگر افراد کو نومسلم برہمن کی امام باڑے اور مزار کے احاطے میں تدفین پر تحفظات تھے۔ یہ تحفظات کیوں تھے، گو کہ یہ ایک طویل داستان ہے لیکن ہم کوشش کریں گے کہ اس مختصر تحریر میں پوری صورتحال سے آپ کو آگاہ کر دیں۔

میر پور خاص کے علاقے نائی پاڑے میں سُکھ دیو نام کا ایک نوجوان اپنے خاندان کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔ اس کے گھر کے قریب ایک مندر بھی تھا جہاں وہ اور اس کے اہل خانہ پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ مندر کے قریب ہی ایک مزار اور امام باڑا بھی تھا۔ سُکھ دیو تقسیم ہند کے بعد اپنے بڑے بھائی کے ساتھ انڈیا چلے گئے تھے، لیکن جنم بھومی کی یاد نے انھیں چین سے نہ رہنے دیا اور وہ کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ پاکستان لوٹ آئے اور نائی پاڑے میں دوبارہ سکونت اختیار کرلی۔

اس پاڑے میں سُکھ دیو کا قدیم مندر غیر آباد ہو چکا تھا، لیکن مزار پر اب بھی کچھ لوگ آتے

تھے اور محرم میں وہاں پر چھوٹی چھوٹی مجالس عزا بھی منعقد ہوتی تھیں۔ علاقے میں تقسیم ہند کے بعد انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمان آباد ہیں۔ انھوں نے کمالِ مہربانی سے مندر کی ظاہری حیثیت کو بالکل نہیں چھیڑا، حتیٰ کہ اس کے مرکزی دروازے پر لگی تختی بھی اب تک محفوظ ہے۔ لیکن مندر کے مرکزی حصے سے متصل تمام رقبے پر، جو ہمارے اندازے کے مطابق تقریباً تین ہزار گز ہوگا، مکانات بن چکے ہیں، جن میں مسلمان رہائش پذیر ہیں۔

جب ہم اپنے دوستوں واحد پہلوانی اور عمران شیخ کے ساتھ مندر کی تصویریں بنا رہے تھے تو ایک نوجوان ہماری جانب آیا اور دھیمے لہجے میں بولا ''بھائی یہ اب صرف نام کا مندر ہے، یہاں کوئی نہیں آتا۔ بنالو پھوٹو (فوٹو)، ہمارے پاس تو کاگج (کاغذات یا دستاویزات) ہے۔ ہم جانے والے نہیں۔'' لیکن ان کی مہربانی کہ انھوں نے مندر کی تصویریں بنانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

یہ مندر میرپور خاص کے محلے نائی پاڑہ میں ہے، لیکن سُکھ دیو جہاں مدفون ہیں وہاں خوب رونق لگی رہتی ہے۔ جہاں مزار ہے وہاں ایک امام بارگاہ بھی ہے جس کا نام ''درگاہ عارب شاہ بخاری'' ہے۔ درگاہ پر ہر روز لوگ منتیں مانگنے آتے ہیں اور مراد پوری ہونے پر نذر و نیاز بھی کرتے ہیں۔

نائی پاڑے کا نام بارہا تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس علاقے کے باسیوں کی نے یہ کوششیں ناکام بنا دیں۔ نائی پاڑے میں ہندو، اہلِ تشیع اور سنی مسلمان آباد ہیں۔ جب سُنی مسلمانوں کی جانب سے علاقے کو ''فیصل ٹاؤن'' کا نام دیا گیا تو سندھی اہلِ تشیع نے اس علاقے کو ''عباس ٹاؤن'' بنا دیا۔ لیکن دونوں فرقوں کی کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں اور نائی پاڑہ اب بھی نائی پاڑہ ہی ہے۔ یہ محلّہ نہ تو فیصل ٹاؤن بن سکا اور نہ ہی عباس ٹاؤن۔

نائی پاڑے کے نام کی کہانی بھی بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔ تقسیم سے قبل اس پاڑے کے رہائشیوں کی کثیر تعداد ہندو برادری سے تعلق رکھتی تھی، جو حجامت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ شہر میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں آباد تھے اور حکمرانوں کا تعلق بھی میرانِ سندھ کے خاندان سے تھا، اس

لیے وہ ہندو نائی چاروناچار مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے والے بچوں کا ختنہ بھی کرتے تھے۔ غالباً ہندو حجام اسے خالص کاروباری معاملہ سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک اس کا دین دھرم سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تقسیم ہند کے بعد نائی پاڑے میں بسنے والے ہندو حجاموں کی اکثریت انڈیا منتقل ہوگئی۔ انڈیا سے پاکستان ہجرت کرنے والوں کا پہلا پڑاؤ میرپور خاص ہی ہوتا تھا۔ حجاموں کی اکثر دکانیں خالی ہوچکی تھیں۔ انڈیا سے آنے والی شیخ برادری کے افراد نے باقی ماندہ ہندو حجاموں کے پاس ملازمت کرلی اور ان سے حجامت کا کام سیکھنا شروع کردیا۔ حالات زیادہ خراب ہوئے تو باقی رہ جانے والے ہندو حجام بھی میرپور خاص کا نائی پاڑہ چھوڑ گئے لیکن مسلمان شیخوں کو اپنا کام سکھا گئے، یوں شیخ برادری کے لوگوں کی شناخت بھی نائی کی حیثیت سے ہونے لگی۔

ان مسلمان شیخوں کی دکانیں اب نائی پاڑے اور اس کی اطراف میں موجود آبادیوں میں ہیں۔ اس برادری کے حاجی ظفر صاحب میرپور خاص کے ناظم رہے اور یہ خاندان آج بھی میرپور خاص کی سیاست میں فعال کردار ادا کررہا ہے، لیکن ان کے ناقدین شہر کے لیے ان کی خدمات کو موضوع بنانے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ شیخ صاحبان اب بھی نائی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ معاف کیجیے، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہمارا موضوع ہندو برہمن کا مندر اور مزار تھا۔ آیئے موضوع پر بات کرتے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب ''تیسری جنس: خواجہ سراؤں کی معاشرت کا ایک مطالعہ'' میں میرپور خاص کے بلوچوں کی فراخ دلی کے بارے میں لکھا تھا اور وہ خواجہ سرا سکھ دیو کے بارے میں تھا۔ اس محلے میں ایک برہمن خواجہ سرا رہتا تھا جس کا نام سکھ دیو تھا۔ بعد میں وہ وہ مسلمان ہوا تو اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھ دیا گیا۔ عبداللہ بہت زیادہ خوبصورت تھا، اس لیے علاقے کے لوگ اسے 'سوہنی' پکارتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا نام 'سوہنی فقیر' ہوگیا۔

سوہنی کا قد چھ فٹ تھا۔ سرخ و سپید رنگ، چوڑی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں تھیں جن میں شفقت کا تاثر واضح ہوتا تھا۔ یا پھر اگر یوں کہا جائے کہ سوہنی ایک شفیق انسان تھا تو بھی غلط نہ ہوگا۔

بچوں سے محبت کرنا اس کی خصوصیت تھی۔ اولاد کی نعمت سے محروم عورتیں اس سے دھاگا بندھوانے جاتی تھیں اور تعویذ بھی لیتی تھیں۔ محلے کی مکین خواتین انھیں دعوتوں کے پیغام بھی بھیجتی تھیں۔ شادی بیاہ کی دعوت ہو یا کسی کے گھر ختنہ ہو، سوہنی فقیر کو لازمی بلایا جاتا تھا، نیز ان سے بچوں کے نام بھی رکھوائے جاتے تھے اور چھٹی پر مٹھائی بھی دی جاتی تھی۔ بدلے میں سوہنی فقیر ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتی تھی۔

سوہنی فقیر نے اپنے مندر کی دیکھ بھال تو نہ کی لیکن محلے میں موجود امام بارگاہ، جو عارب شاہ بخاری کی درگاہ کے نام سے مشہور تھی، کی تزئین و آرائش اور ہر سال میلہ لگانے کا کام اپنے ذمے لے لیا اور یہ تمام اخراجات خواجہ سراؤں کی جانب سے ادا کیے جاتے تھے۔ لُنڈ بلوچوں کے معزز چاچا اللہ رکھیو اور مرتضٰی لُنڈ نے ہمیں بتایا کہ ایک دن سوہنی فقیر نے انھیں پیغام بھیجا کہ وہ شدید بیمار ہے اور ان سے ملنا چاہتی ہے، چنانچہ وہ نماز پڑھ کر ان سے ملنے کے لیے ان کے ڈیرے پر گئے۔

سوہنی فقیر نے ان سے پوچھا ''کیا میں نے عارب شاہ بخاری کی درگاہ اور امام بارگاہ کی کوئی خدمت کی ہے؟'' تو چاچا نے کہا کہ درگاہ اور امام بارگاہ کی رونق آپ سمیت تمام خواجہ سراؤں کی بدولت ہے۔ سوہنی فقیر نے کہا ''کیا مجھے مرنے کے بعد درگاہ میں دفنایا جا سکتا ہے؟''۔ اس سوال پر چاچا اللہ رکھیو اور مرتضٰی حیران رہ گئے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں اس معاملے پر بلوچ برادری کی رائے لینی ہوگی۔

دو دن بعد چاچا کو اطلاع ملی کہ سوہنی فقیر اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ چاچا نے اسی وقت برادری کے نوجوانوں اور معززین کو طلب کیا اور ان کے سامنے سوہنی کی وصیت بیان کی۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ چونکہ سوہنی فقیر کی درگاہ کے لیے بے شمار خدمات ہیں، اور ان کی خواہش بھی تھی کہ انھیں درگاہ کے احاطے میں دفن کیا جائے، اس لیے انھیں وہاں دفن کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس پر محلے کے بعض لوگوں نے دبے دبے الفاظ میں اعتراض کیا کہ ایک خواجہ سرا کو صوفی کی درگاہ میں دفن کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر لُنڈ بلوچوں نے ان کی باتوں کو رد کر کے سوہنی فقیر کی

تدفین اُس کی وصیت کے مطابق درگاہ کے احاطے میں ہی کر دی۔

جب آپ عارب شاہ غازی کی درگاہ میں کبھی جائیں، تو دیکھیں گے کہ درگاہ پر منت مانگنے والے پہلے سوہنی فقیر خواجہ سرا کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہیں اور اس کے بعد عارب شاہ بخاری کے مزار پر حاضری دے کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

❊

سیاسی حلیم

کراچی کے سیاسی مقامات میں ایک اہم مقام مشتاق مرزا کا گھر تھا اور اب بھی ہے۔ مشتاق مرزا نوابزادہ نصراللہ خان کے کراچی میں دست راست تھے۔ وہ نواب صاحب کی پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے سندھ میں روح رواں تھے۔ یوں تو ان کا گھر نوابزادہ نصراللہ خان کی کراچی آمد کے بعد سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ بن جاتا تھا، لیکن اس گھر کی بنیادی حیثیت گھر کا سیاسی کردار تھا، خصوصاً حزب اختلاف کے تعلق سے۔

جب جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کیا اور بارہا جلد از جلد انتخابات کا وعدہ کرنے کے باوجود بھی انتخابات نہ ہوئے، تو مشتاق مرزا کا گھر جنرل ضیاء الحق کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ آیئے سب سے پہلے مشتاق مرزا کے مرزا ہاؤس کا پتا جانیں اور ان کی جانب سے منعقدہ حلیم پارٹی کا احوال بھی۔ یہ حلیم پارٹی سیاسی ہوتی تھی اور اس بہانے نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان بھر کے سیاسی رہنما حلیم پارٹی میں شریک ہوکر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

مرزا ہاؤس کا پتا 245/2/0 بلاک بی 6، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی ہے۔ گو کہ اب ان کے اہل خانہ مرزا ہاؤس سے ڈیفنس منتقل ہوگئے ہیں، لیکن اب بھی وہ ڈیفنس کے ایک ہی گھر میں مشترکہ طور پر رہتے ہیں۔ مشتاق مرزا صاحب نے 1976 میں پی ای سی ایچ ایس کے گھر میں رہائش اختیار کی۔ اس گھر کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ یہ گھر 1976 کے بعد حزب اختلاف کے رہنماؤں کا مسکن رہا۔

مشتاق مرزا صاحب نوابزادہ نصراللہ خان کی پاکستان جمہوری پارٹی سندھ کے صدر تھے

اوران کے انتقال کے بعدان کے بیٹے بشارت مرزا پارٹی کے صدر رہے۔ اس گھر میں منتقل ہونے سے قبل وہ گارڈن ایسٹ کے علاقے عثمان آباد میں رہائش پذیر تھے۔ عثمان آباد میں ہی انھوں نے حلیم کی دعوت کرنے کا آغاز کیا۔ پہلی دعوت میں حلیم کی دو دیگیں پکائیں، جو گھر ہی میں بنیں، اور ان کے بچوں نے تمام رات گھوٹا لگا کر پکائی تھیں۔

لیکن مشتاق مرزا اور گھوٹا لگانے والوں میں شامل ان کے بیٹوں بشارت مرزا اور ارشد مرزا کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ حلیم کی یہ دعوت ایک سیاسی حلیم پارٹی بن جائے گی اور پاکستان کی سیاست میں بغاوت کی علامت ہو جائے گی۔ 1976 میں جب عثمان آباد کی رہائش ترک کر کے مشتاق مرزا کا خاندان پی ای سی ایچ ایس منتقل ہوا تو ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سیاسی تحریک کا آغاز ہوا ہی تھا۔

1977 کے انتخابات ہوئے۔ پی پی کو بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی لیکن ان کی یہ نصرت بہت دیر تک قائم نہیں رہی۔ ضیاء الحق نے ایک عبوری حکومت قائم کی۔ اس حکومت میں پی ڈی پی کے وزراء بھی شامل تھے لیکن بعد میں ان دونوں وزیروں نے استعفے دے دیے تھے۔

مرزا ہاؤس اس وقت بہت نمایاں ہوا جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس وقت مرزا ہاؤس بھٹو کے خلاف کراچی میں ہونے والے اجلاسوں کا مرکز تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کے نوابزادہ نصر اللہ خان کراچی آ کر یہیں ٹھہرتے تھے۔ حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے رہنما ان سے ملاقات کے لیے مرزا ہاؤس آتے تھے۔ ان رہنماؤں میں شاہ مردان شاہ پیر پگارا، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور کے علاوہ دیگر رہنما بھی شامل ہوتے تھے۔

لیکن جب ضیاء الحق کے دور میں تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کا آغاز ہوا تو مرزا ہاؤس ایک بار پھر حزب اختلاف کا مرکز ٹھہرا۔ ایم آر ڈی کی تشکیل میں مشتاق مرزا نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ محترمہ نصرت بھٹو اور نوابزادہ صاحب کی ملاقات کا بندوبست بھی مرزا صاحب نے کیا تھا۔ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی۔ بشارت مرزا کے بقول "والد صاحب نے ہمیں بھی اس جگہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا جہاں ملاقات ہونی تھی۔

ملاقات کے روز پولیس اور خفیہ اداروں کے اہل کاروں نے مرزا ہاؤس کو مکمل طور پر اپنے گھیرے میں لے لیا۔ محترمہ نصرت بھٹو گھر سے برقع پہن کر خفیہ اہلکاروں کو چکمہ دے کر مقررہ مقام پر پہنچ چکی تھیں۔ اب مسئلہ تھا نوابزادہ صاحب کو مقررہ مقام تک پہنچانے کا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ گھر کے پرانے ملازم عبدالحق کو جو نوابزادہ کی خدمت پر مامور تھا اور اس کی جسامت بھی ان جیسی ہی تھی، نوابزادہ نصراللہ کی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنا کر ایک کار کی اگلی نشست پر بٹھا دیا گیا اور بشارت مرزا خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گاڑی جیسے ہی باہر نکلی، پولیس اور خفیہ اہلکاروں میں ہلچل مچ گئی۔ بشارت مرزا تیزی سے گاڑی کو شارع فیصل پر لے آئے اور رفتار بڑھا دی۔ شارع فیصل پر گاڑیوں کا ایک اژدھام رواں دواں تھا اور پولیس کو پیچھا کرنے میں خاصی مشکل پیش آرہی تھی، لیکن آخرکار گورا قبرستان کے قریب پولیس نے گاڑی کو گھیر لیا۔ یہ جگہ موجودہ فنانس اینڈ ٹریڈ سینٹر کے بالکل سامنے تھی۔ اس دوران عبدالحق نے شیروانی اور ترکی ٹوپی اتار دی تھی۔ پولیس نے گاڑی کے دروازے کھولے تاکہ نوابزادہ صاحب کو حراست میں لیں لیکن ان کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ انھوں نے نوابزادہ کو مرزا ہاؤس سے اپنے مخصوص حلیے میں روانہ ہوتے دیکھا تھا اور وہ وہیں سے گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے۔ مگر گاڑی میں نواب زادہ نصراللہ خان نہیں تھے۔ گاڑی راستے میں کہیں رکی بھی نہیں تو نوابزادہ کہاں گئے؟

بشارت مرزا کے مطابق پولیس اور خفیہ اہلکاروں نے ہمیں جانے کا اشارہ کیا لیکن ہمارا پیچھا کرتے رہے۔ ہم گھوم پھر کر دوبارہ مرزا ہاؤس آگئے۔ دوسری جانب ہمارے نکلتے ہی نوابزادہ صاحب مرزا ہاؤس سے نکل کر مقررہ مقام پر پہنچ گئے تھے اور یوں ان کی اور نصرت بھٹو کی ملاقات ہوئی اور ایم آر ڈی کی تشکیل کے تمام معاملات طے پا گئے۔

1985 میں جنرل ضیاء صاحب کی جانب سے کروائے جانے والے غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ بھی مرزا ہاؤس میں ہوا تھا۔ جنرل مشرف نے جب نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹا تو یہ طے پایا کہ اس کے خلاف بھرپور احتجاج طارق روڈ پر واقع اللہ والی چورنگی پر کیا جائے

گا۔ مقررہ مقام پر پہنچنے کے لیے تمام پارٹیوں کے رہنماؤں کو مرزا ہاؤس سے روانہ ہونا تھا۔ متحدہ کا وفد بھی ڈاکٹر فاروق ستار اور کنور خالد یونس کی سربراہی میں مرزا ہاؤس پہنچا۔

نوابزادہ صاحب بھی مرزا ہاؤس میں موجود تھے۔ پولیس نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملازموں نے اطلاع دی کہ پولیس نے گھر کے باہر کھڑی ایک سوک کار سے اسلحہ برآمد کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور کار مالک کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ گاڑی متحدہ کے کسی رہنما کی تھی، پولیس اپنے روایتی حربوں پر اتر آئی تھی اور متحدہ کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے ان پر ناجائز اسلحے کا مقدمہ بنانا چاہتی تھی۔

اب پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ان کو کس طرح گرفتاری سے بچایا جائے۔ مرزا ہاؤس کا ایک عقبی دروازہ بھی ہے۔ وہاں پر پولیس کی توجہ کم تھی لیکن کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک بنگلے کے داخلی دروازے پر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ پولیس کی جانب سے مار دھاڑ شروع کر دی گئی۔ پتا چلا کہ قومی محاذ آزادی کے رہنما معراج محمد خان نے جیسے ہی گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو پولیس نے ہلہ بول دیا اور لاٹھی چارج شروع کر دیا جس کے نتیجے میں معراج محمد خان کا سر پھٹ گیا۔

بشارت مرزا کے بقول اس دوران موقع دیکھ کر ہم نے فاروق ستار، کنور خالد یونس اور ان کی اہلیہ کو عقبی دروازے سے باہر نکالا۔ وہاں سے وہ گھر کے قریب ریلوے ٹریک پر قائم کچی آبادی پہنچے جہاں سے وہ ایک اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ 1990 میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد احتجاجی حکمت عملی طے کرنے کے لیے پہلی آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد بھی مرزا ہاؤس میں ہوا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو مرزا ہاؤس کا باقاعدگی سے دورہ کرتی تھیں۔ اپنے دورِ حکومت میں وہ ایک بار آصف علی زرداری، بلاول اور بختاور کے ہمراہ دعوتِ حلیم میں شرکت کے لیے مرزا ہاؤس تشریف لائیں۔ بشارت مرزا نے ان کے اس دورے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''وہ دوپہر کے فوراً بعد تشریف لے آئیں۔ ہمیں ان کی بحیثیت وزیرِ اعظم مصروفیات کا اندازہ تھا، اس لیے بغیر کوئی تاخیر کیے ان کے اہلِ خانہ اور عملے کو حلیم پیش کر دیا گیا۔

محترمہ چونکہ میری والدہ سے بھی بڑی انسیت رکھتی تھیں اس لیے وہ ان سے ملاقات کے لیے گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئیں۔ محترمہ کی آمد کے تقریباً ایک گھنٹے بعد آصف زرداری واپس لوٹ گئے۔ حلیم کی دیگیں تیار تھیں، لیکن مہمان تھے کہ آ کر نہیں دے رہے تھے۔ ایک ملازم سے کہا کہ وہ باہر جا کر دیکھے کہ کوئی مہمان آ رہے ہیں یا نہیں، تو معلوم ہوا کہ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لیا ہوا تھا اور شارع فیصل پر ہمارے گھر آنے والے مہمانوں کو روک دیا جاتا تھا یا واپس لوٹا دیا جاتا تھا۔

ہماری کیفیت یہ ہوگئی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ہمیں محترمہ کی سکیورٹی کا بھی احساس تھا لیکن جن مہمانوں کو دعوت دی گئی تھی، ان کو پیش آنے والی زحمت کا بھی ادراک تھا، لیکن کیا کرتے۔ محترمہ اس روز تقریباً چار گھنٹے تک مرزا ہاؤس میں رہیں اور ہماری جان پر بنی رہی۔ جب محترمہ روانہ ہوئیں تو ہم نے سکھ کا سانس لیا اور مہمان دعوت میں آنے لگے، حلیم کی وہ دو سو دیگیں جو شام تک ختم ہو جاتیں تھیں، وہ رات گئے تک کھلائی جاتی رہیں۔

مرزا ہاؤس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ سیاسی جماعتیں اوران کے رہنما جو ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے، مرزا ہاؤس میں ایک ہی میز پر بیٹھ کر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ 90 کی دہائی میں جب اس وقت کے مہاجر قومی موومنٹ اور حالیہ متحدہ قومی موومنٹ اور جماعتِ اسلامی کے درمیان کشیدگی عروج پر تھی، تو یہ مرزا ہاؤس ہی تھا جہاں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین اور پروفیسر غفور کے درمیان کشیدگی میں کمی کے لیے مکالمہ ہوا تھا۔

مرزا ہاؤس کا دورہ کرنے والے معروف سیاسی رہنماؤں میں غوث بخش بزنجو، عطا اللہ مینگل اور نواب اکبر بگٹی کے علاوہ بے شمار سیاست دان شامل رہے ہیں۔ مرزا ہاؤس میں حلیم پارٹی میں شرکت کے لیے آنے والوں میں پی پی پی بعد ازاں این پی پی کے رہنما اور نگراں وزیر اعظم غلام مصطفی جتوئی بھی شامل تھے۔ مرزا ہاؤس میں جب مشتاق مرزا کی بڑی صاحبزادی کی شادی ہوئی تو نکاح پڑھانے والے مولانا مفتی محمود تھے جبکہ بشارت مرزا کا نکاح مولانا شاہ احمد نورانی نے پڑھایا تھا۔

بشارت مرزا کا کہنا ہے کہ جب بڑی بہن کی شادی ہوئی تو اس موقع پر قوالی کی محفل کا انتظام کیا گیا تھا۔اس موقع پر پیر پگارا نے والد صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ محفل موسیقی کے لیے انھیں چاہیے کہ اس وقت کی ایک معروف خوش شکل غزل گائیکہ کو مدعو کریں۔پیر صاحب کا کہنا تھا کہ محفل میں شرکت کے لیے مفتی محمود کو میں لے آؤں گا،نوابزادہ نصر اللہ خان کو تم لے آؤ،لیکن مرزا ہاؤس میں محفلِ غزل کی روایت نہیں تھی اس لیے یہ بات ایک خوشگوار یاد کی صورت میں باقی ہے۔

مرزا ہاؤس چونکہ کراچی میں حزبِ اختلاف کا سب سے بڑا سیاسی ڈیرہ تھا،اس لیے اس گھر کو اتنی بار سب جیل قرار دیا گیا کہ بشارت مرزا کو گنتی یاد ہی نہیں۔بشارت مرزا کہتے ہیں کہ جب گھر کو سب جیل قرار دیا جاتا تھا تو مشتاق مرزا کی نقل و حرکت محدود ہو جاتی تھی اور رشتے داروں کے آنے پر بھی پابندی ہوتی تھی۔شروع شروع میں تو ایسی صورت حال میں شدید بے بسی، لاچاری، بے کسی اور غصے کی کیفیت ہوتی تھی،لیکن آہستہ آہستہ اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔گھر کے باہر ڈیوٹی پر متعین پولیس اہلکار بھی اپنے سے ہی لگنے لگتے اور ان کی چائے اور کھانے کا انتظام بھی ہمیں ہی کرنا پڑتا تھا۔

اس گھر کی سیاسی یادوں کا ایک باب اس وقت ختم ہوا جب 5 جولائی 2003 کو مشتاق مرزا صاحب کا انتقال ہوا۔اسی سال ستمبر میں نوابزادہ نصر اللہ خان بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اب مرزا صاحب کا خاندان اپنے اس سیاسی و تاریخی گھر سے کوچ کر کے ڈیفنس منتقل ہو گیا ہے۔ بشارت مرزا اب بھی سیاسی طور پر اتنے ہی فعال ہیں جتنا کہ ان کے والد تھے۔اب بھی وہ سیاسی حلیم کی دعوت کا انعقاد کرتے ہیں لیکن ان دعوتوں میں اب وقفے آنے لگے ہیں، وہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

وے صورتیں یاالٰہی کس ملک بستیاں ہیں
جن کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستیاں ہیں

❁

خواجہ ناظم الدین: وزارتِ عظمیٰ سے تنگ دستی تک

خواجہ ناظم الدین کا شمار پاکستان کے ان ممتاز سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں ان کے ناقدین بھی بیک زبان یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ ایک شریف النفس اور ایمان دار سیاست دان تھے۔ ان کا دورِ حکومت کئی حوالوں سے اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے دور میں ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا، گو کہ یہ مارشل لاء صرف لاہور تک محدود تھا۔ اس دور میں ایک فوجی عدالت نے جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کو سزائے موت سنائی جو بعد میں منسوخ کر دی گئی۔ ان کے دور میں کراچی میں طلباء نے فیسوں میں اضافے کے خلاف احتجاج کیا تو پولیس نے احتجاجی طلباء پر گولی چلائی۔ وہ پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم تھے جنھیں گورنر جنرل نے برطرف کر دیا تھا۔

ان کے دور میں مارشل لاء کے نفاذ سے لے کر طلبا کی ہلاکتوں اور وزیرِ اعظم کی برطرفی کی ایسی روایتیں شروع ہوئیں جو آج 67 برس گزرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ آج بھی ملک کی سڑکوں پر طلبا اور والدین فیسوں میں من مانے اضافے کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ وزرائے اعظم کی برطرفیاں بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ہمارے سابق وزیرِاعظم نواز شریف کی دور بینی کا یا شاید ان کے کسی مشیرِ باتدبیر کا جس نے بتایا ہوگا کہ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کی ایک بڑی وجہ مذہبی انتہا پسندی اور دوسری طلباء تحریک کے دوران طالب علموں کی ہلاکت تھی۔ غالباً اسی لیے انھوں نے فیسوں میں اضافے کا فوری نوٹس لیا اور اسی طرح انتہاء پسندی کے خلاف مہم میں بھی ثابت قدم ہیں۔

خواجہ ناظم الدین اور وزیرِاعظم میاں نواز شریف کے درمیان ایک بڑی قدرِ مشترک ان کی

خوش خوراکی بھی ہے۔ پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ سر ظفر اللہ خان نے اپنے ایک انٹرویو میں، جو معروف صحافی منیر احمد منیر نے اپنی کتاب ''سیاسی اتار چڑھاؤ'' کے صفحہ نمبر 96، 97 پر شائع کیا ہے، میں کہا تھا:

کھاتے یہ بھی بہت تھے۔ جب یہ بنگال (مشرقی پاکستان) میں چیف منسٹر تھے تو ان کے اس وقت کے ایک سیکریٹری نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ کسی نے رات کے کھانے کی دعوت دی تو مان لیا کہ 8 بجے آئیں گے۔ دو تین دن بعد اسی دن کی دعوت کسی اور نے دی تو انھوں نے کہا اچھی بات ہے 7 بجے آجائیں گے۔ دو تین دن بعد کسی اور نے بھی اسی دن کی دعوت دے دی تو کہا اچھی بات ہے آپ کے یہاں 9 بجے آجائیں گے۔

ایک دن میں تین دعوتیں قبول کرلیں۔ 7 بجے، 8 بجے اور 9 بجے۔ سات بجے والی دعوت میں اچھی طرح سے کھایا، وہاں سے 8 بجے والی دعوت میں پہنچے، ابھی درمیان میں ہی تھے کہ طبیعت خراب ہوگئی، گھر تشریف لائے اور ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ صبح سیکریٹری حاضر ہوا تو اس سے کہا ارے میاں وہ ٹیلی فون کرو تیسری جگہ، سیکریٹری نے کہا جی وہ تو رات کو ہی کر دیا تھا کہ طبیعت خراب ہوگئی ہے تشریف نہیں لا سکتے۔ کہنے لگے نہیں نہیں وہاں سے دریافت کرو انھوں نے پکایا کیا تھا۔ جب سیکریٹری نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے اس پر یہ شعر صادر کردیا۔

نہ کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ان کے یہاں کھانا اتنا لذیذ ہوتا تھا جو میں نے کہیں اور دیکھا نہیں۔

یہ تو ان کی خوش خوراکی عالم تھا تقسیم ہند کے بعد، لیکن تقسیم سے قبل بھی ان کی خوش خوراکی اور ان کے نتیجے میں طبیعت خراب ہونے کا واقعہ مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب ''قائداعظم محمد علی جناح میری نظر میں'' کے صفحہ نمبر 137، 136 پر یوں بیان کیا ہے:

مجھے یاد ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن اور بنگال کے ایک محترم

سیاسی رہنما خواجہ ناظم الدین اپریل 1946 کے پہلے ہفتے میں نئی دہلی میں سخت بیمار پڑ گئے اور ایک ہلکے سے دورہ قلب کے بعض آثار نمایاں ہو گئے۔ انھیں فوراً اسپتال پہنچایا گیا اور ایک پرائیوٹ مریض کے طور پر داخل کر دیا گیا۔ ہم لوگ مسٹر جناح کے مکان پر جمع تھے کہ ہم نے یہ خبر سنی کہ ان کی بیماری خطرناک ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیمار دوست اور رفیق کار کو جا کر دیکھیں۔ ہم اسپتال پہنچے جہاں ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب اپنے کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ اور بالکل خوش وخرم ہیں۔ انھوں نے ہمیں یہ خوش خبری دی کہ ان کے دل میں کوئی خرابی نہ ہوئی تھی بلکہ انھیں بدہضمی کی شکایت ہو گئی تھی جس کا باعث کھانے میں بدپرہیزی تھی۔

معروف صحافی اور انسانی حقوق کے کارکن حسین نقی کے مطابق:

1952ء کے اواخر اور 1953ء کے شروع ہوتے ہی طلبہ نے اپنے گوناگوں مسائل کے حل کے لیے مظاہرے کیے جس کی قیادت ڈی ایس ایف گرلز اسٹوڈنٹس کانگریس اور انٹر کالجیٹ باڈی کر رہی تھیں۔ اس کا نقطۂ عروج 8 جنوری 1953ء کی صبح تھی جب کراچی کی انتظامیہ نے طالب علموں کے جلوس پر کئی بار فائرنگ کر کے کم از کم ایک درجن طالب علموں اور شہریوں کو ہلاک اور کافی تعداد میں افراد کو زخمی کر دیا۔

ابھی حکومت کی باگ ڈور سیاست دانوں کے پاس تھی۔ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم، مسٹر فضل الرحمٰن وزیر تعلیم، جبکہ نواب گورمانی وزیر داخلہ تھے۔ حکومت نے انتظامیہ کی فائرنگ سے لاتعلقی اور طالب علموں کے مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ اگر چہ یہ اس حادثہ سے پہلے بھی ممکن تھا، مگر پھر بھی برطانوی دور اقتدار کی انتظامیہ جس کی گرفت پاکستان پر اس وقت تک کافی مضبوط ہو چکی تھی، اس مسئلے کو امن وامان اور قانون کی خلاف ورزی کے تناظر میں ہی سمجھنا اور حل کرنا چاہتی تھی۔ اس تحریک نے مغربی پاکستان بھر میں طالبعلم برادری میں ایک احساسِ یگانگت

پیدا کیا اور اس کی عملی کامیابی نے ڈی ایس ایف کو ایک مقبول طالبعلم تنظیم کی حیثیت دی۔

اس سے قبل بھی ناظم الدین کے دور میں طلبہ مارے گئے تھے۔ ان طلبہ کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا جو بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس تمام صورتحال کو مرزا نورالہدیٰ نے اپنی کتاب ''مولوی تمیز الدین خان بنام وفاق پاکستان''، جس کا ترجمہ وجاہت مسعود نے کیا ہے، کے صفحہ نمبر 261 پر یوں بیان کیا ہے:

> وزیراعظم ناظم الدین نے 1952 میں بنگال کا دورہ کیا اور اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہوگی۔ گویا وہ اپنے ہی وعدے سے انحراف کر رہے تھے جو انھوں نے مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کیا تھا کہ بنگالی زبان کو بھی پاکستان کی سرکاری زبان ہونے کی حیثیت دلوائی جائے گی۔

قبل ازیں اس مسئلے پر ناظم الدین قائداعظم کی اعلانیہ مخالفت کر چکے تھے جب قائداعظم نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے بعد ریس کورس گراؤنڈ کے جلسۂ عام میں اردو کے سرکاری زبان ہونے کا اعلان کیا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس کے بعد خود قائداعظم نے بھی کبھی اس مسئلے پر اظہار خیال نہیں کیا تھا۔ وزیراعظم کے اس اعلان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کے بعد حالات میں ایسی تلاطم خیز تبدیلیاں پیدا ہوئیں کہ تمام منصوبے اور تجاویز دھری کی دھری رہ گئیں۔ فریقین اس مسئلے پر سخت اشتعال میں تھے۔ 21 فروری 1952ء کو پولیس نے بنگالی زبان کے حق میں مظاہرہ کرنے والے طلباء پر گولی چلا دی اور چند طلباء ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد بھی پولیس نے اس پیمانے پر ظلم و تشدد جاری رکھا کہ اس کی مثال ملنا مشکل تھی۔ یہ واقعہ پاکستان کی تاریخ میں فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔

خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت سے متعلق لکھی گئی کتابوں مضامین اور تبصروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل سادہ سے انسان تھے۔ شرافت ان کا وطیرہ تھا اور انھیں اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا قطعاً کوئی اندازہ نہ تھا۔ یہ بات بجا طور پر درست ہے کہ وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری پر بھی یقین رکھتے تھے اس کی سب سے

بڑی دلیل ان کا ہندو ڈرائیور تھا۔ کتاب ''پاکستان کے پہلے سات وزرائے اعظم'' کے صفحہ نمبر 54 پر اس بارے میں درج ہے:

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ان کا ذاتی ڈرائیور ہندو تھا جس کا نام روئی داس تھا۔ وہ ان کا بہت پرانا ملازم تھا۔ جب آپ کا تقرر پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ہو گیا تو آپ اس ڈرائیور کو ڈھاکہ سے اپنے ساتھ لے آئے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد جب آپ نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا تو اسی کو اپنا ڈرائیور رکھا۔ وہ ڈرائیور شراب پیتا تھا، جس کے بارے میں خواجہ صاحب کو علم تھا اور آپ اسے ہمیشہ شراب پینے سے منع فرماتے لیکن اس نے شراب نہ چھوڑی۔

خواجہ صاحب کی حکومت سے معزولی کا ایک بڑا سبب تحریک ختم نبوت بتائی جاتی ہے۔ فروری 1953 میں اس تحریک نے زور پکڑ لیا۔ اس کے نتیجے میں 8 مارچ 1953 میں حکومت کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ جب ان کی حکومت کو برطرف کیا گیا تو جو عوامل بطور جواز پیش کیے گئے تھے، ان میں سے ایک پنجاب کے فسادات بھی تھے۔

لیاقت علی خان کے قتل کے بعد اس وقت کے سیاسی رہنماؤں اور مبصرین کا خیال یہ تھا کہ چونکہ نوکر شاہی کو اپنی مرضی سے امورِ مملکت چلانے کے لیے غلام محمد جیسا شخص درکار تھا۔ وہ اگر وزیر اعظم ہوتا تو بھی کوئی حرج نہ تھا، جبکہ خواجہ صاحب اگر بدستور گورنر جنرل رہتے تو یہ ایک احسن فیصلہ ہوتا۔ لیکن چونکہ خواجہ ناظم الدین کو لیاقت علی خان جیسے طاقت ور وزیر اعظم کی موجودگی میں گورنر جنرل کی کم حیثیتی کا اندازہ تھا، اس لیے انھوں نے وزیر اعظم بننا پسند فرمایا۔ یہ فیصلہ غلام محمد کا اپنا نہیں تھا، بلکہ انھیں یہ عہدہ پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا گیا تھا حالانکہ اس دور میں سردار عبدالرب نشتر اور راجہ غضنفر علی خان جیسی شخصیات اس عہدے کے لیے زیادہ موزوں تھیں۔

بہر حال یہ فیصلہ ہو گیا۔ آخر کار اسی گورنر جنرل نے انھیں برطرف کر دیا۔ برطرفی کے موقعے پر خواجہ ناظم الدین نے غلام محمد سے کہا کہ جب میں گورنر جنرل تھا تو میں نے لیاقت علی خان سے ایسا رویہ روا نہیں رکھا جو آپ نے میرے ساتھ کیا۔ اس کے جواب میں غلام محمد نے کہا

کہ نہ تم لیاقت علی خان ہو اور نہ ہی میں خواجہ ناظم الدین۔ خواجہ صاحب کی برطرفی کے بارے میں ایوب خان نے اپنی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' کے صفحہ نمبر 84 پر لکھا ہے فرینڈز ناٹ ماسٹرز کا اردو ترجمہ، اردو کے نامور ادیب اور افسانہ نگار غلام عباس نے ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' کے نام سے کیا ہے:

ایک بحران 1953 میں آیا جب گورنر جنرل غلام محمد نے اقتصادی بدحالی، قحط کی صورت اور پنجاب کے فسادات کو بہانہ بنا کر خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی بحالی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دستور ساز مجلس میں مجھے اکثریت حاصل ہے اور بقول بعض کے ملکۂ انگلستان سے بھی مدد کی التجا کی مگر کچھ پیش نہ چلی۔ ادھر گورنر جنرل نے محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ خواجہ صاحب کی کابینہ کے متعدد ساتھیوں نے حرص و ہوس میں آ کر نہ سہی مگر بغیر چوں و چرائی کابینہ میں عہدے قبول کر لیے۔

خواجہ ناظم الدین خوش خوراک تھے۔ مرغ بانی کے بھی شوقین تھے اور ان کے اقتدار میں آنے کے بعد جب تک وہ گورنر جنرل رہے، ان کے گھر میں مرغوں کی دیکھ بھال بہت احتیاط سے کی جاتی تھی۔ ایسی ہی صورت حال وزیر اعظم ہاؤس میں بھی رہی۔ ان کے دور میں خوراک کا بحران ہوا تو انھیں قائدِ قلت کا لقب ملا اور خوش خوراکی کی وجہ سے انھیں ناظم الدین کے بجائے ہاضم الدین کہا گیا۔ لیکن اقتدار سے محروم ہونے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی انتہائی کس مپرسی میں گزاری۔ پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب ''روداد چمن'' کے صفحہ نمبر 52 پر لکھتے ہیں:

''خواجہ ناظم الدین مرحوم نے آڑے وقت میں قربانیاں دی تھیں۔ مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی خدمت کی تھی۔ مثلاً جب ہندو اخبارات نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا تو اسی ناظم الدین نے اپنی جملہ آبائی جائیداد بیچ کر مسلمانوں کا انگریزی اخبار ''اسٹار آف انڈیا'' کلکتہ سے جاری کروایا تھا اور خود قلاش بن کر بیٹھ گیا تھا۔ قربانی کے ایک ایسے مجسمے کو کس طرح بے آبرو کر کے ہمیشہ کے لیے سیاست سے نکال دیا گیا؟ اس کو ایسے وقت خلافِ قانون اور خلافِ شرافت پرائم

منسٹری سے ڈسمس کیا گیا، جب وہ ہنوز مسلم لیگ پارٹی کے سربراہ تھے اور پارٹی کا مکمل اعتماد ان کو حاصل تھا۔ ڈسمس ہو جانے کے بعد اس معصوم انسان کے پاس نہ رہنے کا گھر اور نہ معاش کا کوئی ذریعہ رہا۔ عارضی طور پر کراچی کے ایک مخیّر شخص نے ان کی خستہ حالی پر رحم کھا کر ان کو سر چھپانے کے لیے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر دے دیا۔''

میں جب سندھ کا ریونیو وزیر بنا تو وہ میرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کو سندھ میں زمین کا تھوڑا سا غیر آباد ٹکڑا دیا جائے، جہاں وہ مرغبانی کر کے فاقہ کشی سے بچنے کا بندوبست کر سکیں۔ زمین تو میں نے دے دی مگر مرغی خانہ نہ بن سکا، مجبوراً دربدر خاک بسر وہ اپنا یہ حال لے کر ڈھاکہ پہنچے اور وہاں پاکستان کے دوست اور دشمن قائداعظم کے اس قریبی ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ آخر ان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ اپنی کہانی لے کر بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو گئے۔ جس ملک کو بنانے میں ناظم الدین نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ نکل سکی۔ ایک مخلص سیاست دان ناظم الدین کے نام کو بگاڑ کر ہاضم الدین رکھا گیا۔ انھیں قائد قلت قرار دیا گیا۔ ان کے دور میں مذہبی فسادات کے نتیجے میں مارشل لاء لگایا گیا۔ ان ہی کے دور میں بنگالی زبان کو قومی زبان قرار دینے کی تحریک چلی اور لوگ مارے گئے۔ طلبہ نے اپنے حقوق کے حصول کے لے جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان پر بھی گولی چلی اور کئی طلباء اپنی جان سے گئے، لیکن وہ اتنے بے بس تھے کہ وزیراعظم ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکے۔

گورنر جنرل کے بجائے وزیراعظم بننے کا فیصلہ ان کی شدید سیاسی غلطی تھی۔ ایک بیورو کریٹ کو گورنر بنوانا بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ان کی مرضی سے ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیوروکریسی میں موجود چند عناصر نے جو اقتدار پر اپنی گرفت رکھنا چاہتے تھے، اپنا کھیل بہت احتیاط اور چالاکی سے کھیلا اور سیاست دانوں سے غلطیاں کروا کر اپنے مقاصد حاصل کیے، جن کے نتائج کیا کیا نکلے آپ جانتے ہی ہیں۔

❊

کراچی کے ہندوؤں کا جلوسِ عاشور

اگر یہ کہا جائے کہ کراچی کے وسط میں واقع نارائن پورہ غیر مسلموں کی شہر میں سب سے بڑی آبادی ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ نارائن پورہ شہر کی قدیم آبادی رنچھوڑ لائن سے متصل ہے۔ نارائن پورہ میں سب سے بڑی آبادی 'ہریجن برادری' سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کی ہے، دوسرے نمبر پر عیسائی اور تیسرے نمبر پر سکھ آباد ہیں۔ ان تینوں برادریوں کے مذہبی، سماجی اور ثقافتی تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ عاشورہ کے موقعے پر نارائن پورہ سے ذوالجناح اور تعزیے کا جلوس بھی 9 محرم کی شام کو برآمد کیا جاتا ہے، جس میں غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی بڑھ چڑھ کر شرکت کرتے ہیں۔

ہمیں جب اس مذہبی رواداری پر مبنی رسم کی اطلاع ملی تو ہم 8 محرم کی رات کو بڑی تگ ودو کے بعد نارائن پورہ پہنچے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 8 محرم سے لے کر 10 محرم تک بندر روڈ مکمل طور پر بند کر دیا جاتا ہے۔ نارائن پورہ جانے سے قبل ہم نے دریالال مندر کے پجاری وجے مہاراج سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی تو انھوں نے ہمیں دیو جی صاحب کا نمبر دیا، دیو جی صاحب نے ہمارا رابطہ اشوک دیو جی پر دبھیا سے کروایا اور کہا کہ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو وہ وہاں موجود ہوں گے۔

اسی طرح پاکستان سکھ کاؤنسل کے چیئرمین سردار رمیش سنگھ نے بھی یقین دلایا کہ وہ وہاں پہنچنے کی پوری کوشش کریں گے۔ خیر ہم نارائن پورہ پہنچے۔ نارائن پورہ میں رنگ ونور کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ زرق برق ساڑھیوں میں ملبوس ہندو خواتین شہنائی اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہی

تھیں، ایک جانب ٹھنڈے اور میٹھے دودھ کی ایک بہت بڑی سبیل لگی ہوئی تھی، جہاں لوگ دودھ پی رہے تھے۔

سبیل کے منتظم ایک سردار جی سے ہم نے سبیل لگانے کا مقصد دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ عاشورہ کے موقع پر جب ذوالجناح برآمد ہوتا ہے تو یہ سبیل لگاتے ہیں، لیکن چونکہ آج ہندو بھائیوں کے 'دسہرے' کی تقریب بھی منائی جارہی اس لیے زیادہ بڑا انتظام کیا ہے۔

اس موقع پر اشوک دیو جی وہاں پہنچ گئے، اور ہمیں کچھ دیر ٹھہرنے کے لیے کہا، اس کے بعد وہ ہمیں وہاں سے ذوالجناح اور تعزیہ دکھانے کے لیے مزید آگے کی طرف لے گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ ہمیں لے کر ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اور جب ہم اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ذوالجناح 'لکڑی' کا بنا ہوا تھا اور لوگ اس کی سجاوٹ میں مصروف تھے، اور کچھ لوگ ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے کھڑے ہوئے تھے۔

اشوک دیو جی نے بتایا کہ یہ لوگ 'منت' مانگ رہے ہیں۔ ہم جب کمرے سے باہر نکلے تو ایک کم سن بچہ ڈھول اور شہنائی کی تھاپ پر رقص کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ بچے کے والد نے منت مانگی تھی جو پوری ہوگئی، تو وہ ذوالجناح پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آئے ہیں۔

اس موقع پر موجود جیٹھا پٹیل نے ہمیں بتایا کہ ذوالجناح اور تعزیے کا یہ جلوس سو برس سے نکالا جاتا ہے، اس کا آغاز گھنشا بابو نے کیا تھا۔ ان کی اولاد نہیں تھی، تو انھوں نے عاشور کے موقع پر منت مانگی تھی کہ اگر ان کے اولاد ہوئی تو وہ محرم میں گھوڑا دیں گے۔ ان کی منت پوری ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے اس رسم کا آغاز کیا جو آج تک جاری ہے۔

پاکستان سکھ کاؤنسل کے چیئرمین رمیش سنگھ نے بتایا کہ ذوالجناح کے اس جلوس میں سکھ برادری کے افراد بھی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں اور ویسے بھی بابا گرونانک کی تعلیمات کا یہ تقاضا ہے کہ تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد بغیر کسی تفریق کے امن اور رواداری کے ساتھ زندگی گزاریں، اور نارائن پورہ کا یہ محرمی جلوس اس کی عملی مثال ہے۔

نارائن پورہ کی سماجی تنظیم 'شری کاٹھیاواڑی ہریجن نیو جنریشن سیوا کمیٹی' کے عہدے داران

کشن ادھوجی واگلا اور ششی گوکل باڑیا نے ہمیں بتایا کہ کافی عرصے بعد دسہرا اور عاشورہ ایک ساتھ منایا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ذوالجناح اور تعزیہ رکھنے کی جگہ بہت چھوٹی ہے، ان کی حکومت سے درخواست ہے کہ انھیں زیادہ کشادہ جگہ دی جائے تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ذوالجناح اور تعزیہ کی زیارت کر سکیں۔

کراچی کے علاقے صدر میں مینسفیلڈ اسٹریٹ سے بھی ہندو برادری کا ایک تعزیہ برآمد ہوتا ہے۔ اس تعزیے کا آغاز دایا سائیں بابا نے قیامِ پاکستان سے قبل کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فقیر سائیں اس تعزیے کے منتظم ہیں۔ ان کا تعلق ہریجن ہندو برادری سے ہے۔ یہ تعزیہ زیارت کے لیے 9 محرم سے 10 محرم تک لکی اسٹار کے چوک پر رکھا جاتا ہے جہاں ہندو مرد اور خواتین منت ماننے کے لیے آتے ہیں۔ فقیر سائیں نے بتایا کہ پہلے تعزیے کو صدر کی مختلف شاہراہوں پر گشت کروا کر بیٹی جیٹی پر ٹھنڈا کیا جاتا تھا لیکن حالات خراب ہونے کے بعد لکڑی کے تعزیے کو چاندی کے تعزیے میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اب یہ تعزیہ زیارت کے لیے ایک ہی مقام پر رکھا جاتا ہے۔

❊

لیاقت علی خان پر الزامات کی حقیقت

پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کو 16 اکتوبر 1951 کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں قتل کر دیا گیا۔ لیاقت علی خان قائدِ اعظم کے دیرینہ رفیق کار تھے۔ انہی کے دور میں مذہبی جماعتوں نے مملکتِ خداداد پاکستان میں اپنے قدم جمانے شروع کیے۔

ان مذہبی جماعتوں کے عزائم ناکام بنانے کے لیے انھوں نے قراردادِ مقاصد قومی اسمبلی میں متعارف کروائی تاکہ ان کے اثر و نفوذ کو محدود کیا جا سکے۔ لیاقت علی خان کے ناقدین کا کہنا ہے کہ قرارداد مقاصد کی منظوری سے مذہبی جماعتوں کا اثر تو کم نہ ہوا الٹا پاکستان میں ان کو اپنے نظریات نافذ کرنے کا ایک آئینی جواز مل گیا۔ اسی قراردادِ مقاصد کو بعدِ ازاں جنرل ضیاء نے اپنے خود ساختہ اسلامی نظریے کو لاگو کرنے کے لیے آئین کا حصہ بنا دیا۔

کمپنی باغ کے نام کو لیاقت علی خان کے قتل کے بعد لیاقت باغ کا نام دے دیا گیا۔ اسی لیاقت باغ میں ٹھیک 56 سال بعد ایک اور وزیرِاعظم بےنظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ ایم ایس وینکٹے رامانی کی کتاب ''پاکستان میں امریکا کا کردار'' جس کا ترجمہ قاضی جاوید نے اردو میں کیا ہے، کے صفحہ نمبر 233-232 پر لکھا ہے کہ ''قاتل کی ایک گولی نے سماں ہی بدل دیا تھا۔ پاکستانی حکام نے قاتل سید اکبر کو ایک افغان شہری قرار دیا۔ افغان حکومت کے ترجمان نے فوراً پُر زور تردید کی کہ اکبر کو اس کی قوم دُشمن سرگرمیوں کی بنا پر افغان شہریت سے محروم کیا جا چکا تھا اور انگریز حکام نے اسے صوبہ سرحد میں پناہ دے رکھی تھی۔''

جلد ہی یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ انگریزوں نے اس کا جو وظیفہ مقرر کیا تھا وہ حکومتِ پاکستان

بھی ادا کرتی رہی تھی۔ روزنامہ ''نیویارک ٹائمز'' میں ایک ایسوسی ایٹڈ رپورٹ ''حکومت کا وظیفہ خوار پاکستانی قاتل'' کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے مطابق پاکستانی حکام نے یہ انکشاف کیا کہ سید اکبر نامی وہ افغان شہری جس نے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کا قتل کیا وہ حکومت پاکستان کا 450 روپے (155 ڈالر) کا ماہانہ الاؤنس حاصل کرتا تھا۔

ایک بات تو طے ہے کہ لیاقت علی خان کا قاتل سید اکبر اسٹیج کے بالکل سامنے اس قطار میں بیٹھا تھا جہاں سی آئی ڈی والوں کے لیے جگہ مخصوص تھی۔ اپنی نشست سے وہ لیاقت علی خان کو با آسانی نشانہ بنا سکتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ وہ اس نشست تک کیسے پہنچا یہ ایک ایسی کہانی ہے جس پر 56 سال بعد بھی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔

قتل کے فوراً بعد پولیس نے اُسے گرفتار کرنے کے بجائے جان سے مارنے میں عافیت جانی۔ ''نیویارک ٹائمز'' کی رپورٹ کے مطابق ''جب اس نے دو گولیاں چلائیں تو اس کے فوراً بعد پاس بیٹھے افراد اُس پر جھپٹ پڑے، انھوں نے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، اس پر گولیاں بھی چلائی گئیں، اور ان میں کم از کم ایک گولی ایک پولیس افسر نے چلائی تھی جس نے بعدِ ازاں یہ شہادت دی کہ گولی چلانے کا حکم ایک اعلیٰ افسر نے دیا تھا۔''

ایک لمحے کے لیے ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ ایسا ہی ہوا تھا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جلسہ گاہ کی اگلی نشستیں تو سی آئی ڈی والوں کے لیے مخصوص ہوتی تھیں۔ اگر سید اکبر وہاں اکیلا پہنچ بھی گیا تو کیا پولیس کے تربیت یافتہ اہل کار یہ نہیں جانتے تھے کہ قاتل کو جان سے مارنے کے بجائے زندہ گرفتار کیا جانا چاہیے؟

جب اتنے سارے لوگ سید اکبر پر جھپٹے ہوں گے جنھوں نے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں، تو اس کے بعد وہ یقیناً اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ اپنے پستول کا مزید استعمال کرے۔ کیا وجہ تھی کہ ایک اعلیٰ پولیس افسر نے اس کے باوجود اُسے گولی مارنے کا حکم دیا اور ان کے اس حکم پر فوری عمل درآمد بھی ہو گیا؟

شواہد مٹانے کا دوسرا واقعہ بھی اسی جگہ پیش آیا۔ 2007 میں جب بے نظیر بھٹو لیاقت باغ

میں جلسے کے بعد قتل ہوئیں تو اس کے فوراً بعد راولپنڈی فائر بریگیڈ کے عملے نے جائے وقوعہ کو پانی کے ذریعے دھو کر چمکا ڈالا۔ ان کا یہ عمل آج بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ اقوامِ متحدہ کے تحقیقاتی کمیشن کے مطابق جائے وقوعہ سے سیکڑوں شواہد مل سکتے تھے مگر دھوئے جانے کے بعد صرف چند ایک ہی مل پائے۔

خیر یہ الگ کہانی ہے۔ لیاقت علی خان کے قاتل کو وظیفہ ڈالرز کی شکل میں ملتا تھا اور ڈالر امریکا کی کرنسی ہے۔ لیاقت علی خان پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انھوں نے پاکستان کو امریکا کی جھولی میں اس وقت ڈال دیا جب انھوں نے روس کے بجائے امریکا کے دورے کی دعوت قبول کی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم سے قبل اور اس کے فوراً بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ پاکستان روسی نہیں بلکہ امریکی بلاک میں شامل ہوگا۔

امریکی محکمۂ خارجہ کے ایک ریٹائرڈ افسر ڈینس ککس اپنی کتاب The United States and Pakistan 1997 - 2000 کے صفحہ نمبر 13-12 پر لکھتے ہیں کہ امریکی سفارت کار ریمنڈ ہیئر نے جب مئی 1947 میں نئی مملکت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں جناح سے پوچھا تو اُن کا کہنا تھا کہ پاکستان کا جھکاؤ مشرقِ وسطیٰ کی مسلمان ریاستوں کی جانب ہوگا کیونکہ وہ کمزور ہیں۔ مسلم ممالک کو روسی جارحیت کے خلاف شانہ بشانہ متحد ہونا ہوگا اور اس کے لیے انھیں امریکی معاونت درکار ہوگی۔ جناح کے بقول انھوں نے عوامی سطح پر اس بات کا اظہار نہیں کیا لیکن مسلمانوں کی اکثریت یہ سوچتی ہے کہ امریکیوں کا رویہ دوستانہ نہیں ہے۔ اُن کا تاثر یہ ہے کہ امریکی پریس اور بہت سارے امریکی پاکستان کے خلاف ہیں۔

یہ تو تھے جناح صاحب کے روس مخالف خیالات جو تقسیم سے قبل تھے لیکن اُن کے یہ خیالات تقسیم کے بعد اور زیادہ راسخ ہو گئے تھے۔ اس کا ذکر آگے کریں گے۔ اس سے پہلے اس الزام کا ذکر ہو جائے کہ لیاقت علی خان نے روسی دورے کو پس پشت ڈال کر امریکا جانے کو کیوں ترجیح دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ روس نے لیاقت علی خان کو دورے کی دعوت ہی نہیں دی تھی بلکہ یہ دعوت حاصل ہوگئی تھی۔

1949 میں امریکی صدر ٹرومین نے ہندوستانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو امریکا کے دورے پر مدعو کیا۔ پاکستانی وزیرِ اعظم لیاقت علی خان، جو اپنی مغرب نواز پالیسوں سے خاصے معروف تھے، کو اپنی سبکی کا احساس ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ مغرب کے دوست وہ تھے لیکن نہرو کو جنھیں ایک سوشلسٹ اور کمیونسٹ سمجھا جاتا تھا، امریکا کے دورے کے لیے مدعو کیا گیا۔

اس دعوت نے ان کی انا کو شدید ٹھیس پہنچائی۔ اس کا حل ایک سینئر مسلم لیگی رہنما اور اس وقت تہران میں پاکستان کے سفیر راجہ غضنفر علی خان نے نکالا۔ ان کے ایران میں روسی سفارت کار سے بہت اچھے تعلقات تھے انھوں نے ایک عشائیے کا بندوبست کیا جس میں روسی سفارت کار علی علوی اور لیاقت علی خان کی ملاقات ہوئی۔ لیاقت علی خان نے اس موقع پر اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ روس کا دورہ کرنا چاہتے ہیں۔ 2 جون 1949 کو اُن کو روس کے دورے کی دعوت موصول ہوگئی اور اس کے ٹھیک 5 دن بعد لیاقت علی خان نے روس کی دعوت قبول کر لی۔

یہ بات پاکستان کی امریکی زدہ نوکر شاہی پر گراں گزری، اور اس کے ساتھ ساتھ برطانویوں اور امریکیوں پر بھی۔ برطانیہ نے اس فیصلے کو تحمل سے برداشت کیا لیکن امریکیوں کے لیے یہ ناقابل قبول تھا۔ کراچی میں برطانوی ہائی کمشنر سر لارینس گرافٹی اسمتھ نے سر ظفر اللہ خان کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دورہ امریکا اور برطانیہ کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کرے گا۔ آخر کار یہ دورہ منسوخ ہو گیا۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ روس اور امریکا دونوں کی جانب سے لیاقت علی خان کو بیک وقت دورے کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن ہم عرض کر چکے ہیں ایسا نہیں تھا۔ روس کے دورے کی منسوخی اور امریکی دورے کی قبولیت کا الزام بھی لیاقت علی خان کے سر ہے۔ ایسا بھی کچھ نہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ روس کے دورے کی دعوت لیاقت علی خان کی خواہش پر آئی تھی۔

ڈینس ککس اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 33 پر لکھتے ہیں کہ ''پاکستان نے ابتدائی طور پر یہ تجویز کیا تھا کہ لیاقت علی خان 20 اگست 1949 کو ماسکو پہنچیں گے جبکہ روسیوں کی رائے تھی کہ وہ 15 اگست کو ماسکو پہنچیں۔ پاکستان کا مؤقف یہ تھا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ 14 اگست کو وزیر اعظم یوم

آزادی کی تقریبات میں مصروف ہوں گے۔

روسی حکام نے یہ تجویز کیا کہ دورہ دو ماہ بعد نومبر کو ہونا چاہیے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کا اصرار تھا کہ ایلچیوں کی تعیناتی بھی دورے سے قبل ضروری ہے لیکن وہ پاکستان میں سفیر کی تعیناتی کے سلسلے میں 28 اکتوبر تک ناکام رہے۔اکتوبر 1949 میں پاکستان کے سیکریٹری خارجہ اکرام اللہ نے برطانوی ہائی کمشنر گرافٹی اسمتھ کو یقین دلایا کہ روسی حکام وزیراعظم پاکستان کے دورے کے معاملے پر ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں، اسی سبب وزیراعظم کا پاسپورٹ گزشتہ 3 ہفتوں سے نئی دہلی میں روسی سفارت خانے میں پڑا ہوا ہے۔

ان حقائق سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ لیاقت علی خان روس کا دورہ کرنا چاہتے تھے، لیکن روسی حکام نے گو کہ انھیں دعوت نامہ بھیج دیا، مگر شرط 20 اگست کے بجائے 15 اگست رکھ دی جو ممکن نہ تھی۔ تقسیم ہند کے بعد روس کی ہمدردیاں تو ویسے ہی ہندوستان کے ساتھ تھیں۔ روسی سیاست دانوں کو بخوبی اس بات کا اندازہ تھا کہ انڈیا ہی ان کا قدرتی اتحادی ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی سفارت کاروں نے اس دورے کو منسوخ یا ناکام بنانے کے لیے اپنے طور پر کوششیں کی ہوں۔

ہم لیاقت علی خان پر اس الزام کا ذکر پہلے بھی کر چکے ہیں کہ وہ امریکا نواز تھے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ روایت انھیں ورثے میں جناح صاحب سے ملی تھی۔ جناح صاحب کی امریکا دوستی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ 15 اکتوبر 1947 میں قائداعظم کے ایلچی لائق علی نے امریکی حکام کو ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں ان سے پاکستان کو قرضے کی فراہمی کی درخواست کی گئی تھی۔

ایم ایس وینکٹے رامانی کی کتاب ''پاکستان میں امریکا کا کردار'' کے اردو ترجمے کے صفحہ نمبر 24-23 پر درج ہے کہ لائق علی نے محکمۂ خارجہ کو دو مزید کاغذات پیش کیے۔ایک میں پاکستان کی ضروریات کی تشریح تھی اور دوسرے میں مختلف ضرورتوں کا جواز پیش کیا گیا تھا۔ان میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کو صنعتی ترقی کے لیے 70 کروڑ ڈالر، زرعی ترقی کے لیے 70 کروڑ ڈالر اور اپنی دفاعی سروسز کی تعمیر و آلات کی فراہمی کے لیے 51 کروڑ ڈالر درکار ہیں۔ دو ارب ڈالر کے لگ بھگ

مجموعی رقم پانچ برس کی مدت میں استعمال کے لیے قرضے کے طور پر طلب کی گئی تھی۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک بات تو واضح ہے کہ لیاقت علی خان نے پاک امریکا دوستی کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ آغاز قائدِ اعظم کی زندگی میں تقسیم ہند سے قبل ہو چکا تھا۔ لیاقت علی خان کے ساتھ ایک المیہ یہ تھا کہ انھوں نے جناح صاحب جیسے بااختیار گورنر جنرل کے ساتھ کام کیا تھا۔ جب تک جناح صاحب حیات رہے، کابینہ کے تمام اجلاس ان کی سربراہی میں ہوتے تھے اور فیصلہ کن شخصیت ان ہی کی تھی۔

لیاقت علی خان کے پورے دورِ حکومت میں آئین نہ بن سکا۔ انھیں اپنے ہم عصر سیاست دانوں خصوصاً حسین شہید سہروردی کی عوامی مقبولیت کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا۔ لیاقت علی خان ایک انتہائی محتاط شخص تھے۔ حد یہ تھی کہ وہ بھی انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے لیکن ان کی پوری کوشش تھی کہ ان کے دفتری عملے میں کوئی ایسا فرد نہ ہو جو انڈیا اور پاکستان کی دہری شہریت رکھتا ہو۔ نعیم احمد کی مرتب کردہ کتاب ''پاکستان کے پہلے سات وزرائے اعظم'' کے صفحہ نمبر 40-39 پر لکھا ہے:

''وزیرِ اعظم عملے کے انتخاب میں نہایت محتاط تھے۔ جب کام ذرا زیادہ بڑھا تو اپنے ذاتی عملے میں ایک اور افسر کا اضافہ کیا، یعنی آپ نے ایک ڈپٹی پرائیویٹ سیکریٹری کی تعیناتی کا فیصلہ کیا۔ اس افسر کے انتخاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔''

وزیرِ اعظم کو تین آدمیوں کے نام تجویز کیے گئے۔ انھوں نے میاں منظور احمد کو چنا۔ ایم ایم احمد کا انتخاب اس بناء پر کیا گیا تھا کہ ان کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا، جبکہ دوسرے دو کا تعلق اتر پردیش وغیرہ سے تھا اور ان کے رشتے دار اتر پردیش میں موجود تھے۔

ایسا فیصلہ کسی علاقائی تعصب کی بناء پر نہیں تھا بلکہ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ چونکہ پاکستان نیا نیا بنا تھا اور وزیرِ اعظم کے دفتر میں نہایت اہم اور خفیہ دستاویزات ہوتی تھیں، اس لیے ایسا آدمی زیادہ بہتر سمجھا گیا جس کا ہندوستان سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو۔ کیونکہ وہ لوگ جن کے رشتے دار ابھی ہندوستان میں موجود تھے، ان کی حیثیت ابھی دو کشتیوں میں سوار کی سی تھی۔ ہندوستانی ایجنٹ کسی

وقت بھی ایسے آدمی کو خرید سکتے تھے۔

لیاقت علی خان پر مہاجر نوازی کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے لیکن اس مثال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بطور وزیر اعظم وہ کسی بھی ایسے اردو بولنے والے پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھے جن کے تقسیم کے بعد بھی انڈیا میں رشتے دار بستے ہوں۔ لیاقت علی خان پر ایک اور الزام یہ بھی ہے کہ انھوں نے مذہب کو سیاست میں آئینی اور قانونی طور پر متعارف کروایا، لیکن وہ اس معاملے میں بھی محتاط تھے کہ ان کے عملے میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جس کی کسی مذہبی تنظیم سے جذباتی وابستگی ہو۔ نعیم احمد اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 20-19 پر اس کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں:

''پرائم منسٹر برانچ میں ایک کلرک جس کا نام رحمت الٰہی تھا، وہ اس برانچ میں سرکاری کاغذات ڈائری کرنے کے کام کرتا تھا۔ یہ آدمی نہایت خاموش اور سنجیدہ قسم کا تھا۔ چند ماہ نوکری کے بعد اس شخص کے بارے میں انٹیلی جنس بیورو سے یہ رپورٹ آئی کہ اس کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ اس شخص کو یہ مشورہ دیا گیا کہ اگر وہ یہ کہہ دے کہ اس کا جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں تو اس کی ملازمت کو کوئی خطرہ نہ ہو گا ورنہ اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا۔''

لیکن وہ نہایت دلیر انسان تھا۔ اس نے جواب دیا کہ جماعت سے وابستگی کی وجہ سے ایسی ہی رپورٹ کی بناء پر اسے فوج سے جہاں وہ بطور کمیشنڈ افسر زیر تربیت تھا، نکال دیا گیا تھا۔ یہاں تو میں صرف ایک کلرک ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ لہٰذا رحمت الٰہی نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ رحمت الٰہی وہ ہیں جو اب چودھری رحمت الٰہی کے نام سے جماعت اسلامی کے بڑے کارکنوں میں شامل ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ان کی کابینہ میں بطور وزیر پانی و بجلی کچھ عرصہ کام کرتے رہے۔

پاکستان میں لیاقت علی خان سے لے کر بینظیر بھٹو تک جتنے بھی سیاسی لیڈر قتل ہوئے اُن کے قتل کی سازش کس نے، کب اور کیوں تیار کی یہ ایک راز ہی ہے۔ لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیق کرنے والے افسر اور اس سے متعلق تمام دستاویزات ایک ہوائی حادثے میں انجام کو پہنچ گئیں۔ سید نور احمد اپنی کتاب ''مارشل لاء سے مارشل لاء تک'' کے صفحہ نمبر 397-396 پر اس تمام کہانی کو

یوں بیان کرتے ہیں:

''نوابزادہ اعتزاز الدین جو اس مقدمے کی تفتیش کے متعلق اہم کاغذات ساتھ لے کر وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی طلبی پر ان سے گفتگو کرنے کے لیے ہوائی جہاز سے جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ہوائی جہاز کا یہ حادثہ جہلم کے قریب پیش آیا جہاں کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے جہاز کو آگ لگ گئی اور مسافر اور ان کا سامان (اور لیاقت علی خان کے قتل کے مقدمے سے متعلق اہم کاغذات) نذرِ آتش ہو گئے۔''

لیاقت علی خان کے قتل کے بعد جو نئی کابینہ بنی تھی، اس میں نواب مشتاق احمد گورمانی کو جو اس سے پہلے وزیر برائے امورِ کشمیر تھے، وزیرِ داخلہ کا عہدہ مل گیا تھا۔ قتل کے متعلق تفتیش بے نتیجہ رہی تو لامحالہ گورمانی صاحب کو اعتراضات کا نشانہ بننا پڑا۔ ان اعتراضات سے بچنے کے لیے انھوں نے بہت دیر بعد ایک مرحلے پر انگلستان کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مدد حاصل کی اور وہاں سے ایک ماہر سراغ رساں کو بلا کر تفتیش پر مامور کیا۔ لیکن یہ اقدام بھی محض اتمام حجت ثابت ہوا۔ اس سے لیاقت علی خان کے قتل کے اسباب پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی۔

اس کے بعد 1958 میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ فروری 1958 میں جب ہتکِ عزت کا مشہور مقدمہ گورمانی بنام زیڈ اے سلہری لاہور میں ہائی کورٹ کے ایک جج کے روبرو زیرِ سماعت تھا تو ایک نکتے کی تصدیق کے لیے عدالت نے لیاقت علی خان کے قتل کے متعلق پولیس کی تفتیشی کارروائیوں کی فائل کا ملاحظہ کرنا چاہا اور اٹارنی جنرل پاکستان سے جو عدالت میں موجود تھے، دریافت کیا کہ کیا اس تفتیش کے متعلق سرکاری فائل عدالت کو مہیا کی جا سکتی ہے؟

اٹارنی جنرل نے 25 فروری 1958 تک ضروری معلومات مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ پورا نہ ہوا تو عدالت نے اٹارنی جنرل کو ایک چٹھی بھجوائی۔ اس نے جواب میں کہا کہ متعلقہ فائل حکومتِ مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری کی تحویل میں ہے۔ عدالت نے اس فائل کو منگوانے کے لیے سمن جاری کر دیے۔ یکم مارچ 1958 کو صوبائی حکومت کے ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت کے سامنے پیش ہو کر بیان کیا کہ متعلقہ فائل گم ہے۔ اس کی تلاش کی جا رہی ہے۔ اس

تلاش کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مانگی گئی۔ 8 مارچ کو سی آئی ڈی کے ایک افسر نے عدالت کو مطلع کیا کہ تلاش کے باوجود اس فائل کا کوئی پتا نہیں چل سکا لہٰذا حکومت اسے پیش کرنے سے معذور ہے۔

لیاقت علی خان کے قتل پر سیاستدانوں کے رویوں کے بارے میں ایوب خان اپنی کتاب ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' کے صفحہ نمبر 70 پر لکھتے ہیں:

> جب میں پاکستان واپس آیا تو مجھے کراچی میں نئی کابینہ کے اراکین سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدین، چودھری محمد علی، مشتاق احمد گورمانی اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کی۔ ان میں سے کسی نے نہ تو مسٹر لیاقت علی خان کا نام لیا اور نہ ان کے منھ سے اس واقعے پر افسوس یا دردمندی کے دو بول ہی نکلے۔

گورنر جنرل غلام محمد بھی اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے تھے کہ ایک قاتل کی سنگ دلانہ حرکت نے ملک کو ایک نہایت قابل اور ممتاز وزیر اعظم سے محروم کر دیا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ انسان کیسا بے حس، بے درد اور خود غرض واقع ہوا ہے۔ ان حضرات میں سے ہر ایک نے خود کو کسی نہ کسی طرح ترقی کے بام بلند پر پہنچا دیا تھا۔ وزیر اعظم کی موت نے گویا ان کے لیے ترقی کی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ اس بات سے دل میں حد درجہ کراہت اور نفرت پیدا ہوتی تھی۔ بات تو بے شک تلخ ہے، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو کہ وہ واحد ہستی جو ان سب کو قابو میں رکھ سکتی تھی، دنیا سے اُٹھ گئی ہے۔

❁

قومی ترانہ: دھن، شاعری اور تنازعات

قیامِ پاکستان کے بعد 7 برس تک پاکستان کا کوئی قومی ترانہ نہ تھا۔ کچھ ترانے تھے جو مختلف سرکاری تقریبات پر گائے جاتے تھے۔ پاکستانی قیادت کو آئین بنانے میں جتنی دشواریوں کا سامنا تھا، اتنا ہی قومی ترانہ بنانے میں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ فیصلہ کرنا ہو کہ ترانہ کس زبان میں لکھا جائے، کیونکہ پاکستان کے اکثریتی علاقے مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان بولی جاتی تھی، جبکہ مغربی پاکستان میں 4 زبانیں یعنی سندھی، بلوچی، پنجابی اور پشتو بولی جاتی تھیں، جبکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی زبانوں سے ہٹ کر اردو کو قائدِ اعظم محمد علی جناح صاحب کی جانب سے قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ اس بات پر مشرقی پاکستان میں بسنے والے بنگالی خاصے معترض تھے۔

عقیل عباس جعفری اپنی کتاب ''پاکستان کا قومی ترانہ: کیا ہے حقیقت کیا ہے فسانہ؟'' میں لکھتے ہیں کہ:

> 4 اگست 1954 کو کابینہ کا ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس میں حفیظ جالندھری کے لکھے گئے ترانے کو بغیر کسی ردوبدل کے منظور کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں کابینہ نے یہ فیصلہ بھی دیا کہ اس ترانے کی موجودگی میں اردو اور بنگالی کے دو قومی نغمات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کے خالق کا انتقال 5 فروری 1953 کو ہوا، جبکہ قومی ترانے کی دھن اور ترانے کی منظوری 4 اگست 1954 کو ہوئی۔ انھیں اپنی زندگی میں یہ دن دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ ان کی اس خدمت کا اعتراف بھی ایک بڑے عرصے بعد کیا گیا۔ جمیل زبیری اپنی

کتاب ''یادخزانہ ریڈیو پاکستان میں 25 سال'' کے صفحہ نمبر 21 پر قومی ترانہ کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''پاکستان کے قومی ترانے کی دھن محمد علی چھاگلہ (کتاب میں شاید پروف کی غلطی کی وجہ سے احمد غلام علی کی جگہ محمد علی لکھ دیا گیا ہے لہٰذا ہم نے من وعن لکھ دیا ہے) نے بنائی۔ اس کے بعد اس دھن پر ترانے لکھنے کے لیے ملک کے تمام شعراء کو مدعو کیا گیا اور سب سے بہتر ترانے کا فیصلہ کرنے کے لیے حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل دے دی تھی۔''

جب چھاگلہ کی بنائی ہوئی دھن ریڈیو پاکستان میں اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری نے سنی تو انھوں نے سب سے پہلے نہال عبداللہ کمپوزر وغیرہ کو بٹھا کر اس دھن کو موسیقی کی زبان میں ''باندھا'' اور پھر اس پر سب سے پہلے ترانے کے بول لکھے۔ اسی دوران میں حفیظ جالندھری اور دیگر شعراء کے لکھے ہوئے ترانے موصول ہو گئے۔ سارے ترانے کمیٹی کے سامنے رکھے گئے اور کمیٹی نے حفیظ جالندھری کے ترانے کو منظور کر لیا۔

کہتے ہیں کہ بخاری اس پر کافی ناراض ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ سب سے پہلے انھوں نے ترانہ لکھا۔ بہرحال کمیٹی کا فیصلہ حتمی تھا۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان کے انگریزی پروگراموں کی سپروائیزر مسز فیلڈ برگ (Feld Berg) نے اس کی orchestration کرنے اور notation تیار کرنے کے لیے لندن بھیج دیا۔ جب یہ چیزیں تیار ہو کر ترانہ واپس آیا تو ریڈیو پاکستان میں اس کی ریکارڈنگ ڈائریکٹر جنرل بخاری اور حمید نسیم نے مل کر کی۔ گانے والوں میں نہال عبداللہ، دائم حسین، نظیر بیگم، رشیدہ بیگم، تنویر جہاں، کوکب جہاں، اور چند دیگر فنکار شامل تھے۔ اس طرح ریڈیو پاکستان نے ملک کا قومی ترانہ تیار کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کب ترتیب دی گئی؟ اور کیا اس سے پہلے بھی کوئی قومی ترانہ تھا یا نہیں؟ سینیئر صحافی نعمت اللہ بخاری کا کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے اسکولوں میں ترانے کے لیے علامہ اقبال کی مشہور نظم ''چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' پڑھی جاتی تھی۔

انسانی حقوق کے کارکن اقبال علوی کا کہنا ہے ان کے دور میں اقبال کی مشہور نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' پڑھی جاتی تھی۔ لیکن کیا کہیے کہ یہ دونوں نظمیں پاکستان کا قومی ترانہ نہ بن سکیں۔ عقیل عباس جعفری کے مطابق 1960 میں امین الرحمٰن نے ایک مضمون میں پاکستان کے قومی ترانے کی دھن تیار کرنے کا قصہ یوں بیان کیا ہے:

''1950 کے اوائل میں ایران کے جواں سال حکمراں رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران، حکومت کی دعوت پر پاکستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ شہنشاہ ایران کے استقبال کی تقریب پر رواج و آداب کے لحاظ سے ضروری تھا کہ معزز مہمان کا استقبال قومی ترانے سے کیا جائے۔ چنانچہ سرکاری طور پر پاکستان کے قومی ترانے کی ضرورت شدید طور پر محسوس کی گئی۔''

احمد غلام علی چھاگلہ ہمارے پڑھے لکھے موسیقی داں طبقے میں ایک ماہرِ موسیقی کی حیثیت سے غیر معروف نہ تھے۔ اس تنگ وقت میں جناب چھاگلہ نے صحت کی خرابی کے باوجود شب و روز محنتِ شاقہ سے کام کیا اور آخر کار پاکستان کے قومی ترانے کے لیے ایک مناسب دھن مرتب کر ہی لی۔ جب شہنشاہ ایران پاکستان تشریف لائے تو ہمارے بحریہ کے بینڈ نے اس ترانے کو شہنشاہ ایران کے استقبال کے موقع پر بجایا، جو اسے سن کر بہت متاثر ہوئے۔

پاکستان کا پہلا قومی ترانہ کس نے لکھا، اس سلسلے میں گزشتہ ایک دہائی سے دانش وروں اور صحافیوں کے درمیان ایک جنگ چل رہی ہے۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ پاکستان کا پہلا قومی ترانہ جگن ناتھ آزاد نے لکھا تھا، اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد کے ایک انٹرویو کا حوالہ دیا جاتا ہے جس کے مطابق جناح صاحب نے انھیں یہ کام سونپا تھا کہ وہ پاکستان کا قومی ترانہ لکھیں۔ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جگن ناتھ آزاد نے کہیں بھی اپنے ترانے کو ترانہ نہیں کہا۔ لیکن یہ ایک جنگ ہے جو تا حال جاری ہے۔

سینیئر صحافی نعیم احمد نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ: ''مجھے نہیں لگتا کہ جگن ناتھ آزاد سے جناح صاحب نے قومی ترانہ لکھنے کے لیے کہا ہوگا، اگر ایسا ہوتا تو جگن ناتھ آزاد اس بات کو فخریہ بتاتے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جناح کو اردو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی جگن ناتھ

آزاد اور جناح صاحب کبھی کسی شہر میں یکجا رہے ہیں۔"

اگر نعیم صاحب کی بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ اردو سے ناواقف ہونے کے باوجود قائدِ اعظم کا اصرار تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی، حالانکہ سابقہ مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش میں بسنے والے ان کی اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بنگالی چاہتے تھے کہ پاکستان کا قومی ترانہ ایسا ہو جس میں بنگالی زبان کے الفاظ بھی شامل ہوں۔ لیکن ان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

عقیل عباس جعفری اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر 37 پر لکھتے ہیں کہ:

> ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ کے مطالعے اور ڈاکٹر صفدر محمود کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ 14 اور 15 اگست 1947 کی درمیانی شب ریڈیو پاکستان کی اولین نشریات میں جگن ناتھ آزاد کا کوئی نغمہ یا کوئی ترانہ شامل نہ تھا۔ ممکن ہے کہ جگن ناتھ کا تحریر کردہ نغمہ جسے وہ خود ترانہ اور ان کے مداحین قومی ترانہ کہنے پر مصر ہیں، بعد میں کسی اور وقت نشر ہوا ہو، مگر ابھی تک ریڈیو پاکستان کا کوئی ریکارڈ یا ریڈیو پاکستان سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کی کوئی تحریر اس کی بھی تصدیق نہیں کر سکی ہے۔

جمیل زبیری نے اپنی کتاب ''یادخزانہ، ریڈیو پاکستان میں 25 سال'' کے ابتدائیے میں ایک انکشاف کیا ہے کہ سندھ کے پہلے ریڈیو اسٹیشن نے 4 اگست 1947 کو اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس ریڈیو اسٹیشن کے قیام کا بنیادی خیال ایس کے حیدر نامی شخص کا تھا۔ جن کی کراچی میں ریڈیو کی دکان تھی۔ انھوں نے اس سلسلے میں اے ایم چھاگلہ سے مشورہ کیا اس کے بعد وہ دونوں حکومتِ سندھ کے اس وقت کے ایک مشیر اڈوانی سے ملے اور کچھ پرانے ٹرانسمیٹر وں کی مرمت کر کے تین کمروں پر مشتمل ایک ریڈیو اسٹیشن بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا نام ''سندھ گورنمنٹ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن'' رکھا گیا۔ 10 اگست سے اس کی باقاعدہ نشریات کا آغاز ہوگیا۔ 14 اگست 1947 کو اس اسٹیشن سے پاکستان کے قیام اور قائدِ اعظم کے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف

اٹھانے کی کارروائی کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا گیا۔ اس ریڈیو اسٹیشن کی نشریات صرف دس روز جاری رہیں۔ 20 اگست 1947 کو اسے بند کر دیا گیا کیونکہ وائرلیس ایکٹ کے تحت کوئی بھی صوبائی حکومت ریڈیو اسٹیشن نہیں چلا سکتی تھی۔

کراچی کے بارے میں معروف محقق گل حسن کلمتی اپنی کتاب ''کراچی کے لافانی کردار'' کے صفحہ نمبر 241 پر لکھتے ہیں:

> ممکن ہے اسی تجرباتی ریڈیو اسٹیشن سے جگن ناتھ آزاد کا ترانہ بھی نشر کیا گیا ہو، لیکن اس بات کی تصدیق کرنے والوں میں سے اب کوئی بھی حیات نہیں۔ اس میں مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔

قومی ترانے کی دھن 1950 میں ترتیب دی گئی، لیکن اس قومی ترانے کی منظوری آزادی کے تقریباً 7 سال بعد 1954 میں ہوئی۔ چھاگلہ صاحب نے یہ دھن بنائی اور بڑی محنت سے بنائی۔ اس کا اندازہ دھن سنتے ہی ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اس دھن کی منظوری نہ دیکھ سکے اور نہ ہی اس سلسلے میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ان کی اس بے بہا خدمت کا اعتراف کیا گیا۔ ان کی اس خدمت کے صلے کے لیے ان کے خاندان کو تقریباً 46 برس تک انتظار کرنا پڑا۔ گل حسن کلمتی اپنی کتاب ''کراچی کے لافانی کردار'' کے صفحہ نمبر 242 پر لکھتے ہیں کہ:

> آخرکار 43 سال بعد 1996 میں محترمہ بینظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں احمد علی چھاگلہ صاحب کو صدارتی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایوارڈ چھاگلہ صاحب کے فرزند عبدالخالق چھاگلہ جو کہ اب امریکی ریاست ہیوسٹن میں مقیم ہیں، انھوں نے واشنگٹن ڈی سی میں 23 مارچ 1997 میں پاکستانی سفارت خانے میں منعقد ہونے والی تقریب میں وصول کیا۔'' چلیں ''دیر لگی آنے میں تم کو، شکر ہے پھر بھی آئے تو۔

حفیظ جالندھری کا انتقال 21 دسمبر 1982 کو ہوا۔ حکومتِ پاکستان حفیظ جالندھری کی اس خواہش پر ایک عرصے تک غور کرتی رہی کہ انھیں ان کی خواہش کے مطابق علامہ اقبال کے پہلو میں دفنایا جائے یا کہیں اور۔ معروف مؤرخ اور محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مطابق حکومت پاکستان

ان کی یہ آخری خواہش پوری نہ کر سکی۔ ابتدا میں انھیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں امانتاً دفن کیا گیا۔ بعد ازاں مینارِ پاکستان کے باغ میں ان کا مقبرہ بنا کر انھیں وہاں دفن کیا گیا۔ یہ تھا پاکستان کے قومی ترانے کی دھن اور شاعری کا قصہ۔

❁

روپلو کولہی سے کرشنا کولہی تک

سینیٹر کرشنا کولہی صحرائی علاقے تھر کے شہر ننگر پارکر سے تعلق رکھتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے ان کو سینیٹ کا ٹکٹ ملتے ہی الیکٹرانک میڈیا، اخبارات، رسائل اور ویب سائٹس پر ایک طوفان برپا ہو گیا، جنھیں پڑھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کرشنا کولہی کے سینیٹ کا ممبر بننے کے بعد نچلی ذات کے ہندوؤں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا اور راوی مستقبل میں نچلی ذات کے ہندوؤں کے لیے چین ہی چین کا ورد کرے گا۔

کرشنا کولہی بہت ہی سادہ دل خاتون ہیں۔ انھوں نے سینٹ کی ممبر منتخب ہونے کے بعد 12 مارچ 2018 کو حلف لیا۔ جس کے بعد وہ ایوان بالا سے باہر نکلیں، تو انھوں نے جذبات کی رو میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کولہی برادری کو نمائندگی دی گئی ہے۔ کرشنا کولہی نے کہا کہ وہ چیئرمین بلاول بھٹو زرداری صاحب، آصف علی زرداری صاحب اور ادی (بہن) فریال تالپور کی بہت احسان مند ہیں کہ جنھوں نے مجھے اس قابل سمجھا اور ہماری کولہی برادری کو نمائندگی دی۔

ہم کرشنا کولہی کی معلومات میں اضافہ کیے دیتے ہیں۔ کولہی برادری کو پہلی بار قومی اسمبلی میں نمائندگی 1985 کے غیر جماعتی انتخابات میں حاصل ہوئی تھی۔ اور ان کے نمائندے پارومل ''پریم پارکری'' سابق پرائمری ٹیچر، رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔ اس اسمبلی میں نچلی جاتی کے وہ تنہا نمائندے نہیں تھے۔ بلکہ میرپور خاص سے گل جی میگھواڑ بھی رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے

تھے۔ان انتخابات میں پاکستان کے انقلابی کمیونسٹ رہنما 'سوبھوگیان چندانی' نے بھی حصہ لیا تھا اور اطلاعات کے مطابق وہ انتخابات میں کامیاب بھی ہوئے تھے، لیکن بھلا ضیاء الحق جیسا 'راسخ العقیدہ' مسلمان یہ کہاں برداشت کرسکتا تھا کہ ایک ہندو کمیونسٹ قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہوکر اسمبلی میں مظلوموں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرے۔اس لیے انتخابات کے نتیجے کے مطابق چندانی ناکام رہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ہم بات کر رہے تھے کرشنا کولہی کی جو، اب ایوان بالا کی رُکن ہیں۔سینیٹ کے پہلے اجلاس میں اُن کی سب سے خوب صورت بات یہ تھی کہ وہ کولہیوں کے روایتی لباس میں شریک ہوئیں۔جبکہ نومنتخب چیرمین سینیٹ سمیت پاکستان کے مختلف علاقوں سے منتخب سینیٹ اراکین کے لباس کا جائزہ لیں تو کوئی بھی ہمیں اپنے روایتی لباس میں نظرنہیں آیا۔گمانِ عام ہے کہ سینیٹ وہ ادارہ ہے جہاں تمام صوبوں کی یکساں نمائندگی ہے۔کرشنا کولہی کو دیکھتے ہوئے میں یہ تصور کر رہا تھا کہ کاش اس دن چیئرمین سینیٹ صادق سنجرانی صاحب روایتی بلوچی پگڑی پہنے ہوتے اور اُن کے انتخاب پر طنز کرنے والے حاصل بزنجو بھی اُسی روایتی پگڑی میں ہوتے، راجا ظفرالحق بھی پنجاب کے روایتی لباس کُرتا اور دھوتی میں ملبوس ہوتے۔ڈپٹی چیئرمین سینیٹ کے امیدوار کاکڑ صاحب بھی بلوچستان کے پشتونوں کے روایتی لباس میں سینیٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آتے۔کاش مولابخش چانڈیو نے بھی اُس اجلاس میں شرکت کے وقت سندھی ٹوپی پہنی ہوتی اور اجرک اوڑھی ہوتی تو کیا ہی مزہ آتا۔

اب ہم ذکر کریں گے روپلو کولہی کا جو سندھ کی سیاسی تاریخ میں بغاوت کی علامت ہیں۔پارومل پریمی اپنی کتاب ''لوک ساگر کے موتی'' میں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> روپلو کولہی پارکر کا ایک بہادر ہیرو، تعلقہ ننگر پارکر کی گاؤں کنبھاری کا باسی تھا۔اس کے والد کا نام سامت اور ماں کا نام کیسر بائی تھا۔اس کی ماں کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔جب ہندوستان کے مشہور ڈاکو ٹھاکر بلونت سنگھ چوہان نے آکر پارکر میں پناہ لی، اُس وقت اس نے روپلو کی ستائش کرتے

ہوئے کہا کہ روپو ہمارا بھانجا ہے کیونکہ اُس کی ماں چوہان ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی کوئی موتی کا دانہ ہوتا ہے اور شیروں کا غول نہیں ہوتا۔ اس نے انگریز ٹروٹ سے لڑتے ہوئے پارکر کی دھرتی اور ٹھاکروں کے لیے اپنی جان قربان کردی۔ ہندوؤں میں رواج ہے کہ گاؤں کے رہائشی میگھواڑوں سے لے کر برہمن تک ہر لڑکی کو بیٹی سمجھا جاتا تھا۔ غالباً بلونت سنگھ نے اسی روایت کی پاس داری کی۔ روپلو کولہی نے صرف انگریزوں کے خلاف ہی جدوجہد نہیں کی تھی بلکہ وہ مقامی حکمرانوں کے بھی خلاف تھا۔

روپلو کولہی کی ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد کا آغاز اُس وقت ہوا جب اُس نے پارکر کے ٹھاکروں کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ کہانی کچھ یوں ہے کہ ویراواء کے حکمران سوڈھو (ٹھاکر) لادھو سنگھ اور اس کے بیٹوں نے اپنی جاگیر کے علاوہ آس پاس کے گاؤں میں بسنے والے تمام افراد کے لیے حکم جاری کیا کہ وہ اپنے جانوروں سے حاصل ہونے والے دودھ کا ایک حصہ دربار کو فراہم کریں۔ اس وقت افیم کھانے کا رواج عام تھا۔ صبح شام پیالے بھر بھر کے افیم پی جاتی تھی۔ جس کے سبب ٹھاکروں کو دودھ اور دہی کی بہت زیادہ طلب ہوتی تھی۔ اس وجہ سے دودھ کی قلت شروع ہوگئی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں لسی بلونا بند ہوگیا، دودھ، دہی اور لسی کے لیے معصوم بچے تک ترسنے لگے۔ آخر کار علاقے کے لوگوں نے تنگ آکر آپس میں مشورہ کیا اور طے کیا کہ کنبھاری چل کر روپلو کولہی سے ٹھاکروں کے اس حکم کی شکایت کی جائے۔ اگلے روز تمام علاقہ مکین روپلو کولہی کے پاس شکایت کے لیے پہنچ گئے۔ روپلو نے تمام لوگوں کا استقبال کیا اور ان کی بات کو ہمدردی اور غور سے سُنا۔ روپلو نے سمجھ لیا کہ ویرواء کے ٹھاکروں کے ساتھ اس حکم کے خلاف دو دو ہاتھ کرنے پڑیں گے۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے حاضرین سے کہا کہ دودھ کی فراہمی بند کردیں اور سوڈھوں (ٹھاکروں) کو بتادیں کہ دودھ کی فراہمی روپلو نے بند کروائی ہے۔ اس واقعے کی خبر جب سوڈھوں (ٹھاکروں) کو ہوئی تو آگ بگولا ہوگئے۔ وہ اپنے حواریوں سمیت مسلح ہوکر کنبھاری جا پہنچے۔ روپلو پہلے ہی تیار تھا۔ وہ بھی کنبھاری سے کچھ فاصلے پر اپنے مسلح ساتھیوں

سمیت ان کے مقابل آ پہنچا۔ اس نے ٹھاکروں سے کہا کہ راجاؤں کی یہ ریت نہیں جیسے آپ کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے غریب لوگوں کے دودھ سے بھرے برتن اُلٹ دیے ہیں۔ لوگ آپ کو دودھ دے کر لٹ گئے ہیں۔ آپ لوگوں نے معصوم بچوں کو دودھ اور لسی سے محروم کر کے قہر برپا کر دیا ہے۔ بچوں کی چیخیں کوسوں دُور سنائی دیتی ہیں۔ اس ظلم کے سبب رعایا مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ وہاں لوگوں کے ہجوم جمع ہو گئے۔ کسی ایک دانش مند شخص نے یہ سارا معاملہ دیکھ کر ٹھاکروں کو ایک جانب لے جا کر انھیں مشورہ دیا کہ اچھا یہی ہوگا کہ روپلو سے مزاحمت کی بجائے اسے آشیرواد دے کر اپنا بنالو کیونکہ یہ بہادر کولی کبھی بھی کام آسکتا ہے۔ ٹھاکروں نے عقل مندی اختیار کرتے ہوئے روپلو کو گلے لگایا اور اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ کر واپس لوٹ گئے۔ اس واقعے کے بعد روپلو کی شان میں اضافہ ہوا اور وہ کولھیوں کا قومی سردار کہلانے لگا۔

پارول پریکی اپنی کتاب میں صفحہ نمبر 28 پر لکھتے ہیں کہ:

1857 کے آخری عشرے میں بلوے کی آگ بجھ گئی، لیکن جاگیرداروں، نوابوں، مقامی ریاستوں اور وطن پرستوں کی دلوں میں آزادی کے دیپ جگمگا رہے تھے۔ اس بات کا اثر پارکر پر بھی ہوا۔ پارکر کے سوڈھے (ٹھاکر) بے پروا ہو کر اپنی راہ پر چل رہے تھے۔ وہ نہ انگریز اہل کاروں کے حکم کی پروا کرتے تھے۔ افیم کی فروخت سرعام ہوتی تھی۔ سینڈھوری والا ناکہ جہاں سے گجرات کی طرف آنے اور جانے والوں سے ٹیکس ٹھاکروں کی جانب سے پرمار کولی وصول کرتے تھے۔ چراگاہوں اور نمک کی کان پر بھی ٹھاکروں کا قبضہ تھا اور ٹیکس وصول کرنے والی پالیسی کے تحت پیتھاپور جاگیر میں لے پالک بیٹے کو قبول نہ کرتے ہوئے اُن سے چھین لی۔ انھی اسباب کے سبب ٹھاکر پرجوش ہو گئے اور رانپور کے ٹیلاٹ رانا سنگھ کے بُلاوے پر تمام سوڈھے (ٹھاکر) اور کولی مسلح ہو کر میدان میں اتر آئے اور بغاوت کا علم بلند کیا۔ رانا سنگھ کے بُلاوے پر دیراوہ کا ٹھاکر لادھو سنگھ، پیتھاپور کا سوڈھو کلجی اور دوسرے چھوٹے گاؤں کے ٹھاکر، مسلح ہو کر رانپور میں اس کے

کیمپ میں پہنچے۔ بھوڈسر کے ٹھاکر راناکرن سنگھ سے پرانی رنجش کے سبب ٹروٹ سے جاملے۔ ٹھاکروں کے پاس کوئی منظم لشکر نہیں تھا۔ وہ جنگ کے موقعے پر ہی تیاری کرتے تھے۔ ٹھاکروں کی فوج کا دارومدار کولہی سپاہیوں پر تھا۔ اسی بنا پر لادو سنگھ خود کنبھاری پہنچا اور روپلو سے جنگ کے لیے مدد طلب کی۔ روپلو نے اپنے برادر نسبتی ڈ.جی مکوانی سے جنگ کے معاملے پر مشورہ کیا۔ اس موقع پر روپلو نے ایک شعر پڑھا۔ یہ پرجوش شعر سنتے ہی ڈ.جی فوراً گھوڑے پر سوار ہو گیا اور دو دن کے اندر اندر پانچ ہزار کولہی جو تیروں، بھالوں، چھریوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے اکٹھا کیے۔ روپلو کی قیادت میں کولہیوں کا یہ لشکر اونٹوں، گھوڑوں اور پیادوں پر مشتمل تھا۔ یہ کنبھاری سے انگریزوں کے خلاف نعرے بلند کرتے ہوئے رانپور کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں انھیں رات ہو گئی جہاں چار بیل پکڑ کر ذبح کیے اور باجرے میں پکا کر اپنی بھوک مٹائی۔ اس دوران انھوں نے علاقے سے رلیاں (روایتی سندھی چادریں) جمع کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹروٹ نے اپنے کیمپ کے باہر مضبوط باڑ لگائی ہوئی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ باڑ پر رلیاں بچھا کر پھر حملہ کیا جائے گا۔ ضروری صلاح مشورے کے بعد پندرہ اپریل اٹھارہ سو انسٹھ چاند کی چودھویں رات میں حملہ کیا گیا۔ انگریزوں کے بے شمار سپاہی مارے گئے اور کچھ فرار ہو گئے۔ ٹروٹ ایک خفیہ دروازے کے ذریعے ننگر پار کر کے شمال میں گوٹھ پورن واہ میں لادو مینگھواڑ کے گھر میں ایک بہت بڑے مٹی کے برتن میں جا کر چھپ گیا (مینگھواڑ برادری کے لوگ عموماً ماضی میں جوتے بنانے کا کام کرتے تھے، اسی سبب ہندو برادری کے دوسرے لوگ اُن سے نفرت کرتے تھے، اُس کی وجہ یہ تھی کہ جوتے بنانے کے عمل میں گائے کی کھال استعمال کی جاتی تھی اور اُن کھالوں کو مٹی کے ایک قد آدم برتن میں گیلا کرنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ اس برتن سے بہت زیادہ بدبو اٹھتی تھی اس لیے گھر میں آنے والے افراد اس

طرف جانے سے پرہیز کرتے تھے)۔ کولہی وہاں بھی جا پہنچے۔ پورے گھر کی تلاشی لی لیکن وہ نفرت اور تعفن کے سبب اس برتن کی جانب نہیں گئے۔ لادو نے حلف دے کر اپنی گلو خلاصی کرائی۔ اگلی رات لادو نے ایک برق رفتار اونٹ پر ٹروٹ کو حیدر آباد روانہ کیا۔ پارکری فوج نے مختار کار آفس پر حملہ کر کے خزانہ لوٹ لیا۔ پولیس کے باغی سپاہی بھی ان کی فوج میں شامل ہو گئے۔ کچہری (عدالت) کو بھی آگ لگا دی گئی۔ محکمہ مال کا ریکارڈ جلا دیا گیا۔ ٹیلی گراف کی تاریں کاٹ کر پول گرا دیے گئے۔ گجرات اور سندھ کی جانب جانے والے راستے بھی بند کر دیے گئے۔ اس عمل کی وجہ سے ٹھاکروں کی دوبارہ ننگر پارکر پر حکمرانی قائم ہوگئی۔

اس عارضی فتح کے بعد ٹھاکر اور کولہی یہ سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے مکمل فتح حاصل کر لی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ٹروٹ نے حیدر آباد پہنچتے ہی کرنل ایونس کی زیر نگرانی ایک بڑی فوج تیار کروائی اور کراچی سے توپ خانہ بھی طلب کیا گیا۔ یہ میر پور خاص، مٹھی اور اسلام کوٹ فتح کرتے ہوئے ویرواہ پہنچے۔ اس حملے کے نتیجے میں جدید ہتھیاروں کی وجہ سے کلجی کا سوڈھا (ٹھاکر) ٹھاکروں، کولہیوں تیر کمانوں، تلواروں، بھالوں اور نیزوں سے مسلح سپاہیوں نے اپنی جان قربان کی۔ لادھو سنگھ کو قید کیا گیا۔ رانپور کا راجا کرن سنگھ، بال بچوں سمیت روپو کی سربراہی میں کارونجھر کے پہاڑی علاقے میں جا چھپا۔ ٹروٹ نے توپوں کی مدد سے زمین آسمان ایک کر دیا اور اس طرح انگریزوں کا پارکر پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ پارو مل اپنی کتاب 'لوک ساگر کے موتی'' میں رقم طراز ہیں کہ اس جنگ کے نتیجے میں پانچ ہزار کولہی جان سے ہاتھ بیٹھے۔ بے شمار گھر اجڑ گئے، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے اور علاقہ مقتل کا منظر پیش کرنے لگا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کارونجھر کا پہاڑی سلسلہ 144 مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے میں رانا کرن سنگھ اور اس کے اہل خانہ جو روپلو کی نگرانی اور پناہ میں تھے انھیں ٹروٹ آسانی سے گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بوڈیسر کے ٹھاکروں کی مدد سے رشوت اور لالچ کے عوض لوگ خریدے گئے۔ جن میں مہاوجی لھانہ ہنس پوری باؤ اور لادھو مینگھواڑ نمایاں تھے۔ کچھ دنوں بعد

کارونجھر میں رہنے والوں کا راشن ختم ہوا۔ بعد ازاں روپلو راشن کے حصول اور ٹروٹ فوج پر نظر رکھنے کے لیے ایک سادھو کے بھیس میں متعلقہ علاقے میں پہنچا تھا۔ ٹروٹ نے اس کی گرفتاری کے لیے لوگوں کو تیار کر رکھا تھا لیکن روپلو انھیں چکمہ دے کر دوبارہ اپنی کمین گاہ پر پہنچ جاتا تھا۔ اس ساری صورتحال کے پیش نظر باؤ ہنس پوری نے مشورہ دیا کہ کارونجھر کی پہاڑیوں کے اندر جو کنویں ہیں ان کی جانچ کی جائے۔ روپلو اور اس کے ساتھی پانی حاصل کرنے کے لیے ضرور وہاں آئیں گے۔ یہ بات سب کے دل کو بھا گئی اور ٹروٹ نے ان کنوؤں کی تلاش کے بعد اپنے فوجی وہاں پر مقرر کیے۔ پگ واء نامی کنویں پر روپلو روزانہ رات کو آتا تھا۔ وہیں ٹروٹ کے فوجیوں نے چھپ کر اسے گرفتار کیا اور جا کر ٹروٹ کے سامنے پیش کیا۔

روپلو کو انگریزوں نے پھانسی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ روپلو اور انگریزوں کے درمیان جو مکالمات ہوئے وہ ایک طویل کہانی ہے۔ جس کا سرسری ساذکر کر دیتے ہیں۔

ٹروٹ: تمھارا نام کیا ہے

روپلو: (تھری زبان میں جواب دیتے ہوئے) مارو نام روپلو کولی

ٹروٹ: تمھارے دوسرے ساتھ کہاں ہیں؟

روپلو: پیٹ میں

ٹروٹ: نہیں نہیں، وہ بتاؤ کہاں ہیں؟

روپلو: خاموش رہا

ٹروٹ: روپلو، بتاؤ سوڈھے کہاں ہیں؟

روپلو: سوڈھے میرے پیٹ میں ہیں

ٹروٹ: بتاؤ نہیں تو تمھاری حالت بری ہوگی

روپلو: میری ایک ہی بات ہے۔ میرے پیٹ میں ہیں

ٹروٹ: روپلو آج رات کو تم مزید سوچ لو ورنہ کل موت کے لیے تیار ہو جاؤ

پھانسی کے وقت روپلو کی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی بھی طریقے سے سوڈھوں (ٹھاکروں) کی

نشان دہی نہیں کریں گے۔ جس کی بنا پر انگریز نے روپلو پر تشدد اور بربریت کی انتہا کر دی۔ لیکن اس کے باوجود روپلو کا زندہ رہنا انگریزوں کے سر پر تلوار کی منڈلانے کی مانند تھا۔ ٹروٹ نے اپنے حواریوں سے مشورے کیے کہ کیا کیا جائے۔ جس پر مہاوجی لھانہ نے مشورہ دیا کہ روپلو کو پھانسی دے کر قصہ تمام کر دیا جائے۔ ٹروٹ نے تمام انتظامات مکمل کیے اور سخت فوجی محاصرے میں ننگر پارکر کے جنوب مشرقی علاقے میں سوئی گام کے مقام پر کیکر کے درخت کی ایک ڈال پر روپلو کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ واقعہ 21 جون 1859 کے شام کو پیش آیا۔ ٹروٹ نے روپلو کی لاش گم کر دی۔ لیکن کمال یہ ہوا کہ جس کیکر کے درخت پر روپلو کو پھانسی دی گئی تھی وہ درخت تو باقی نہیں رہا لیکن وہاں اب پیلو کے ایک جھاڑ نے جنم لیا ہے جو اب بھی وہاں موجود ہے۔ روپلو تو مر گیا لیکن تھر میں آج بھی وہ زندہ ہے۔

وکٹوریہ میوزیم کی تلاش

ہمارے ایک ملتانی سرائیکی دانش ور دوست محبوب تابش نے ہمیں فون پر اپنے کراچی آنے کے بارے میں بتایا۔ اُس کے ساتھ ہی یہ فرمائش بھی کر ڈالی کہ وہ وکٹوریہ میوزیم بھی دیکھنا چاہیں گے۔ ہم نے حامی بھر لی۔ تین دن بعد وہ کراچی پہنچ گئے۔ اس دوران ہم وکٹوریہ میوزیم والی بات بھول چکے تھے۔ ہم اُنھیں پریس کلب کے قریب ایک رہائشی ہاسٹل لے گئے۔ نہانے دھونے سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے کہا کہ میوزیم کب چلیں گے۔ اب ہم اُنھیں کیا بتاتے۔ کہ ہمیں وکٹوریا میوزیم کی جگہ کے بارے میں کُچھ نہیں معلوم۔ وہ سمجھ گئے۔ بولے کوئی بات نہیں آج اردو بازار چلتے ہیں کل میوزیم چلیں گے۔ ہم نے بھی سُکھ کا سانس لیا اور سوچا کہ کل تک تو پتا چل ہی جائے گا کہ میوزیم کہاں ہے۔ رات کو ہم نے دو تین، دوستوں سے اس بارے میں معلوم کیا۔ سب نے کراچی میں وکٹوریہ میوزیم کے وجود سے انکار کیا۔

اگلے دن ہاسٹل جانے سے پہلے ہم پریس کلب پہنچے اس اُمید پر کہ شاید وکٹوریہ میوزیم کا پتا معلوم ہو جائے۔ کلب میں ہمارے فوٹو جرنلسٹ دوست ماجد بھائی موجود تھے۔ ہم نے ان سے جب اس بابت معلوم کیا تو اُنھوں نے کہا کہ وکٹوریہ میوزیم کے بارے میں تو نہیں معلوم ہاں البتہ ایک میوزیم ہے۔ ہم نے اُن سے پتا پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ اگر آپ کا کبھی آرٹس کاؤنسل جانا ہو تو آپ کو کاؤنسل کی عمارت ختم ہوتے ہی ایک بہت بڑا پارک نظر آئے گا۔ یہ پارک عموماً ویران ہوتا ہے۔ اس پارک کے درمیان میوزیم کی عمارت موجود ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس میوزیم کے بارے میں ہمیں بھی معلوم ہے۔ لیکن یہ نیشنل میوزیم

ہے۔ بہ ہر حال میں محبوب کو لے کر پارک پہنچا۔ پارک کے مرکزی گیٹ پر نیشنل میوزیم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک ٹکٹ گھر بنا ہوا تھا۔ جس میں کوئی موجود نہ تھا۔ میوزیم کی عمارت گیٹ سے تقریباً آدھ فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ خیر ہم یہ فاصلہ طے کر کے میوزیم میں داخل ہو گئے۔ میوزیم کے استقبالیے پر بھی کوئی موجود نہ تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر جیسے ہی پہلی منزل پر پہنچے تو ہمیں اچانک دوڑتے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو ایک پتلے دُبلے سے صاحب نے ہانپتے ہوئے ہم سے ٹکٹ کا مُطالبہ کیا۔ ہم نے اُنھیں بتایا کہ ٹکٹ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ جواباً اُنھوں نے کہا کہ ہم اُنھیں 20 روپے دے دیں۔ ٹکٹ وہ منگوا دیں گے۔ ہم نے اُنھیں پیسے دے دیے۔ اُنھوں نے ہمیں نیچے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر میں ٹکٹ آ گئے۔ ہم نے دورے کا آغاز میوزیم کے دائیں جانب سے کرنا چاہا۔ ایک صاحب نے کہا ترقیاتی کام چل رہا ہے۔ اس لیے ہال بند ہے۔ ہم نے بائیں جانب جانا چاہا تو یہی جواب ملا۔ اُن صاحب نے مشورہ دیا کہ ہم دوسری منزل پر چلے جائیں۔ تو جناب ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ دائیں جانب پہلی گیلری پر قبائلی تمدن گیلری لکھا تھا۔ ہم اُس میں داخل ہو گئے۔ بالکل سامنے ایک شیشے کا بڑا باکس تھا۔ اس میں کچھ گُڑیاں اور گڈے رکھے ہوئے تھے۔ باکس پر انگریزی میں کافرستان لکھا ہوا تھا۔ باکس کے بالکل ساتھ قدیم ہتھیاروں سے لیس ایک بہت بڑا مجسمہ تھا جس کے بارے میں ہمیں وہاں موجود اہل کار نے بتایا کہ یہ کافر کا مجسمہ ہے۔

پاکستان کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے ازراہ مذاق اُن سے پوچھا چونکہ پاکستان میں کافروں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے تو ان کا تعلق کون سے کافروں سے ہے۔ اُنھوں نے فوراً کہا کیلاش والے۔ گیلری میں مختلف صوبوں کی نمائندگی کے لیے بنائے گئے گُڈے اور مجسموں کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک آزادی گیلری تھی۔ گیلری میں تحریک کے حوالے سے سب سے اہم چیز شیشے کے دو باکسوں میں تھیں۔ ایک باکس میں علامہ اقبال کی پگڑی اور چھڑی جب کہ دوسرے باکس

میں لیاقت علی خان کی گھڑی، چھڑی، لائٹر اور سونے کا عطردان رکھا ہوا تھا۔ ایک الگ باکس میں ایک تلوار بھی تھی جو قائداعظم کو ضلعی مسلم لیگ علی گڑھ کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔ ہم اگلی گیلری کی جانب روانہ ہو گئے یہ قرآن گیلری تھی۔ یہاں سب سے پہلے ہمارے جوتے اُتروائے گئے۔ ہم نے اس گیلری کے اندر داخل ہونے سے پہلے اہل کار سے درخواست کی کہ ہماری رہ نمائی فرمائیں۔ اُنھوں اس سلسلے میں معذرت کی اور کہا کہ ہم خود ہی دیکھ لیں۔ اُنھیں اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔ خیر ہم اندر داخل ہو گئے۔ گیلری میں قران پاک کے قدیم نسخے موجود تھے۔ اگلی باری گندھارا تہذیب کی گیلری کی تھی۔ اس گیلری میں گوتم بدھ کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ اچانک ہماری نظر ایک کتبے پر پڑی جس پر ہندو مجسمے لکھا تھا۔ ہم نے وہاں موجود صاحب سے پوچھا کہ یہ تو ہندو مجسمے ہیں۔ باقی کا تعلق کن مذاہب سے ہے۔ اُنھوں نے ناگواری سے ہماری طرف دیکھا اور کہا بدھ مت سے۔ اس کے علاوہ ہڑپہ موئن جو دڑو اور ماقبل تاریخ کی گیلریاں ترقیاتی کاموں کی وجہ سے گزشتہ ایک سال سے بند پڑی ہیں۔ ہمارا یہ دورہ ادھورا رہا۔ ہم جب عمارت سے باہر نکلنے لگے تو استقبالیہ کے بائیں جانب کچھ مورتیاں فرش پر نظر آئیں۔ ہم اُن کی جانب بڑھے۔ ایک صاحب نے ہمارا راستہ رُوک کر ہمیں آگاہ کیا کہ یہ علاقہ ممنوعہ ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ یہ وہ مورتیاں ہیں جو گزشتہ دنوں کراچی سے بیرون ملک اسمگل کرتے ہوئے پکڑی گئیں لیکن تحقیق کے بعد جعلی ثابت ہوئیں۔ ہم نے باتوں ہی باتوں میں اُن سے عمارت کی تاریخ دریافت کی۔ اُنھوں نے کہا کہ اس عمارت کا قیام ۱۹۷۰ میں وجود میں آیا۔ ہم نے اُن سے کہا کہ ہماری معلومات کے مطابق میوزیم جس گارڈن میں قائم ہے بہت قدیم ہے۔ اُنھوں نے اس بات سے اتفاق کیا۔ اور ہمیں بتایا کہ عمارت کے پچھلے حصے میں ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ اُسے دیکھ لیں۔ ہم عمارت کے عقب میں موجود باغ میں پہنچ گئے۔ بالکل آخر میں ایک تختی نظر آئی جس پر ۱۹۲۳، اور اس کے ساتھ ایک پلر پر سوبھراج چیتو ملیٹرس لکھا تھا۔ الیگزینڈر، ایف، بیلی اپنی کتاب کراچی ماضی، حال، مُستقبل میں لکھتے ہیں کہ برنس گارڈن میں ایک نئے میوزیم کا قیام عمل میں آیا جسے

وکٹوریا میوزیم کہا جاتا ہے۔ جب 1851 میں فریئر ہال کی تعمیر مکمل ہوئی تو اُس کی نچلی منزل پر ایک کمرہ میوزیم کے لیے مخصوص کیا گیا۔ جسے بعدازاں برنس گارڈن منتقل کر دیا گیا تھا۔اس کا افتتاح ڈیوک آف کناٹ نے کیا تھا۔ جب کہ معروف مؤرخ عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں لکھتے ہیں کہ چارلس نیپیر نے 1844 میں سندھ کی نادر اشیاء کو جمع کرنے کی غرض سے سندھ ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد کراچی میں ایک عجائب گھر قائم کرنا تھا۔اس ادارے نے بہت سی نادر اشیاء جمع کیں۔مگر چارلس نیپیئر کی مصروفیت کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ چناں چہ تمام جمع شدہ اشیاء کو ایک کمرے میں رکھ کر بند کر دیا گیا۔

1892 میں اسے ڈی جے کالج کے لیے تعمیر ہونے والی نئی عمارت کی بالائی منزل میں منتقل کر دیا گیا اور کراچی میونسپلٹی کو اس کے انتظام کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ میونسپلٹی نے اس کی خوب تزئین کی اور اسے مثالی عجائب گھر بنا دیا۔ان ہی دنوں کراچی میں اس تحریک نے زور پکڑا کہ کراچی کے عجائب گھر کو لندن کے عجائب گھر کی طرز پر ڈھالا جائے۔چناں چہ کراچی میوزیم کو ایک شایان شان میوزیم بنانے کے لیے عوام سے نادر اور قدیم اشیاء کی زیادہ سے زیادہ عطیات دینے کی اپیل کی گئی۔اس دوران 21 مئی 1892 کو میوزیم کی عمارت مکمل ہوگئی۔اس عمارت کو وکٹوریا میوزیم کا نام دے دیا گیا۔محمودہ رضویہ اپنی کتاب ملکہ مشرق شائع مطبوعہ 1947 میں لکھتی ہیں کہ برنس گارڈن میں عجائب گھر ہے۔ جو کہ جنگ کی وجہ سے فریئر ہال منتقل کر دیا گیا تھا۔عجائب گھر میں مردہ جانوروں کو ادویات لگا کر رکھا گیا ہے۔ موہن جودڑو سے دست یاب اشیاء بھی یہاں موجود ہیں۔ ہند اور بیرون ہند کے رہنے والوں کے مجسمے اور دنیا بھر کے مشاہیر کی تصاویر ازاں دو انسانی ڈھانچے بھی رکھے ہیں۔ یہ سب تو اپنی جگہ ٹھیک۔ محبوب واپس ملتان چلے گئے۔لیکن ہمارے ذہن میں یہ سوال چھوڑ گئے کہ آخر وکٹوریہ میوزیم کہاں گیا۔ہمارے ایک دوست اعجاز صاحب سے جب ہم نے اس سلسلے میں بات کی تو انھوں نے کہا کہ ''سونے'' کی تجارت کرنے والی ایک معروف کمپنی جس کا اپنا ایک نجی ٹی وی

چینل بھی ہے۔ اپنے مرکزی دفتر کا پتا اشتہارات میں زیب النسا اسٹریٹ بالمقابل میوزیم بلڈنگ بتاتی ہے۔ ہم زیب النساء اسٹریٹ پہنچے۔ وہاں ایک قدیم عمارت پر کمپنی کا بورڈ لگا تھا۔ اعجاز صاحب کا خیال تھا کہ غالباً یہی میوزیم بلڈنگ ہوگی۔ ہم نے انھیں یاد دلایا کہ پتے میں بالمقابل کہا جاتا ہے۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔

عمارت کے بالمقابل اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کی عمارت تھی ۔ یہ عمارت دیکھتے دیکھتے ہم گلی میں داخل ہو گئے ۔ گلی میں ایک اور قدیم عمارت کے آثار نمایاں تھے۔ اس پر ایک پرانا خستہ حال بورڈ لگا ہوا تھا جس پر وکٹوریہ فرنیچر مارٹ تحریر تھا۔ یہاں سے مایوس ہو کر ہم مذکورہ سونا بیچنے والی کمپنی کے دفتر پہنچے۔ وہاں پر ایک صاحب نے بتایا کہ یہ پتا ان کے پرانے دفتر کا پتا ہے۔ جو زیب النساء اسٹریٹ پر کپڑے کی ایک مشہور دکان کے بالمقابل ہے۔ ہم کپڑے کی دکان پر پہنچے۔ دکان مالک نے بتایا کہ یہاں میوزیم کی کوئی بلڈنگ نہیں تھی۔ ہاں البتہ اس عمارت میں کپڑے کی ایک دکان تھی جس کا نام پاک میوزیم کلاتھ ہاؤس تھا جو عرصہ ہوا بند ہو گئی ہے۔ اس کی تصدیق آس پاس کے دو ایک دکانوں کے مالکان نے بھی کی۔ ہم نے نئے سرے سے وکٹوریہ میوزیم کی تلاش شروع کی۔ ایس ایف مرکا ہم اپنی کتاب دی موزیم آف انڈیا مطبوعہ 1936 میں وکٹوریہ میوزیم کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ موسم گرما میں میوزیم کے اوقات کار 8 بجے صبح سے 11:30 بجے اور شام 3 بجے سے 6 بجے تک ہوتے تھے کہ سردیوں میں 9 بجے صبح سے 12 بجے اور شام 3 بجے 6:30 تک ہوتے تھے۔ جمعہ کا دن ''پردہ نشین'' خواتین اور 12 سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ میوزیم کی بنیاد 1851 میں سر بارٹل فریرے نے رکھی۔ 1870 میں میوزیم کا انتظام ممبئی حکومت سے لے کراچی میونسپل کارپوریشن کے حوالے کر دیا گیا۔ 1928 کو تعمیر ہونے والی عمارت کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ میوزیم برنس گارڈن میں واقع ہے۔ مرکزی ہال کے علاوہ تین کمرے اور اس کے ساتھ راہداریاں بھی ہیں۔ ان کا رقبہ 15000 فٹ ہے۔

نیشنل میوزیم آف پاکستان کے بارے میں 1970 میں مطبوعہ ایک کتابچے کے

مصنف ایس، اے نقوی لکھتے ہیں کہ نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی کے دل میں واقع ہے۔ جہاں شہر کے تمام علاقوں سے لوگ پہنچ سکتے ہیں۔ اس احاطے میں پہلے برنز گارڈن نامی ایک عوامی تفریحی پارک ہے۔ میوزیم جس مقام پر موجود ہے وہ انجل اور اسٹریچن سڑکوں، شاہراہ کمال اتاترک اور کچہری سڑک کے ذریعے یہ سنگم ایک چوراہے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ عوام کے لیے مرکزی دروازہ شاہراہ کمال اتاترک کی طرف واقع ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ میوزیم میں بالغ افراد کے داخلے کی فیس 12 پیسے اور 12 سال سے کم عمر کے بچوں کی داخلہ فیس 6 پیسے ہے۔ ہفتے کے دن میوزیم میں داخلہ مفت ہے۔ ہمارے ایک صحافی دوست اشرف سولنگی جو ہمارے بلاگ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں نے ہمیں مشورہ دیا کہ سپریم کورٹ کراچی رجسٹری کی عمارت بھی ایک قدیم عمارت ہے۔ اس پر بھی آپ کو کچھ لکھنا چاہیے۔ میں نے ہامی بھرلی۔ اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ سپریم کورٹ کی عمارت بھی تو برنس گارڈن سے متصل ہے۔ ہوسکتا ہے وہاں سے کوئی معلومات مل جائیں۔ اگلے دن میں اشرف سولنگی کے ساتھ سپریم کورٹ کراچی کی عمارت پہنچا۔ جہاں ہم نے اسسٹنٹ رجسٹرار شمس فاروقی سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ اس بارے میں انھیں کوئی معلومات نہیں کہ یہ عمارت کتنی قدیم ہے۔ ہاں مگر وہ یہ جانتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح قائداعظم محمد علی جناح نے اسی عمارت میں کیا تھا۔ اور وہ عمارت کی تاریخ کے بارے میں کئی بار اسٹیٹ بینک لکھ چکے ہیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ سپریم کورٹ کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے ہم نے اپنے دوست اعجاز کو فون پر پوری صورتحال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا کمال کرتے ہیں آپ یہی تو وکٹوریا میوزیم ہے۔ ہم نے طنزیہ ان سے کہا کہ پہلے تو آپ اسے زیب النساء اسٹریٹ پر بتا رہے تھے۔ انھوں نے کہا وہ میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ شاید چارلس نیپئر نے جو چیزیں جمع کی تھیں وہ وہیں کہیں کسی عمارت میں رکھی ہوں گی۔ قصہ مختصر ہندی کی ایک مثل ہے۔ مایا تیرے تین نام پرسو، پرسا، پرسرام۔ وکٹوریا میوزیم کے ساتھ بھی غالباً یہی ہوا۔ یہ پہلے وکٹوریا میوزیم تھی، پھر اسٹیٹ بینک بنی پھر کراچی واٹر بورڈ کا دفتر اور اب سپریم

کورٹ کراچی رجسٹری ہے۔ اس کے احاطے میں ایک چھوٹی سی خوب صورت مسجد بھی بنادی گئی ہے جس کا مینار وکٹوریا میوزیم کے گنبد سے اونچا ہے۔

❊
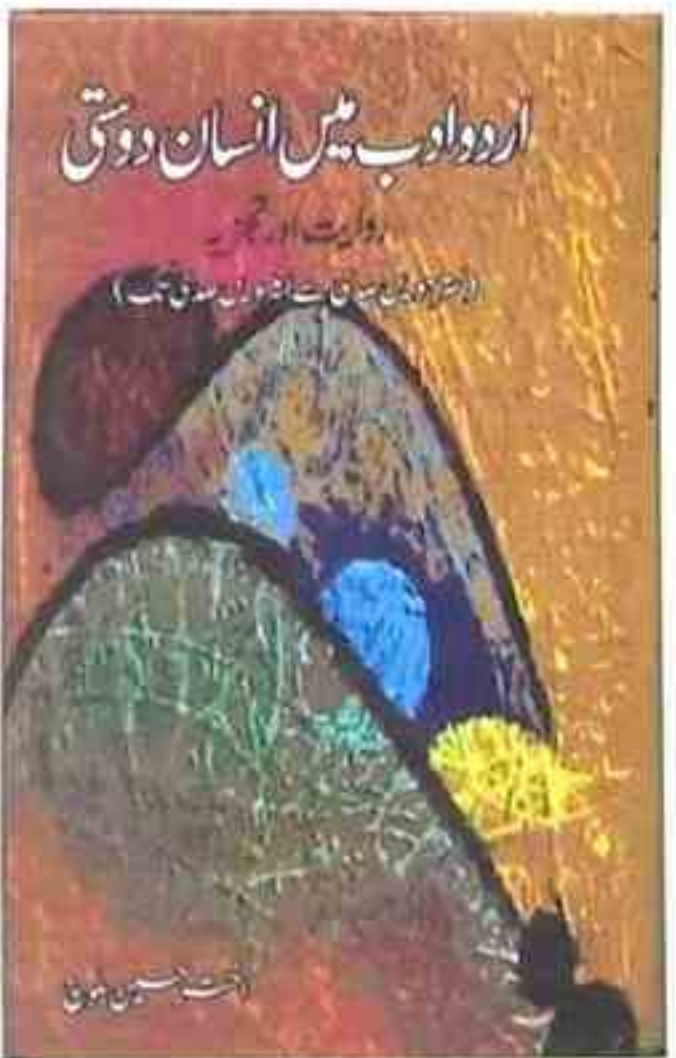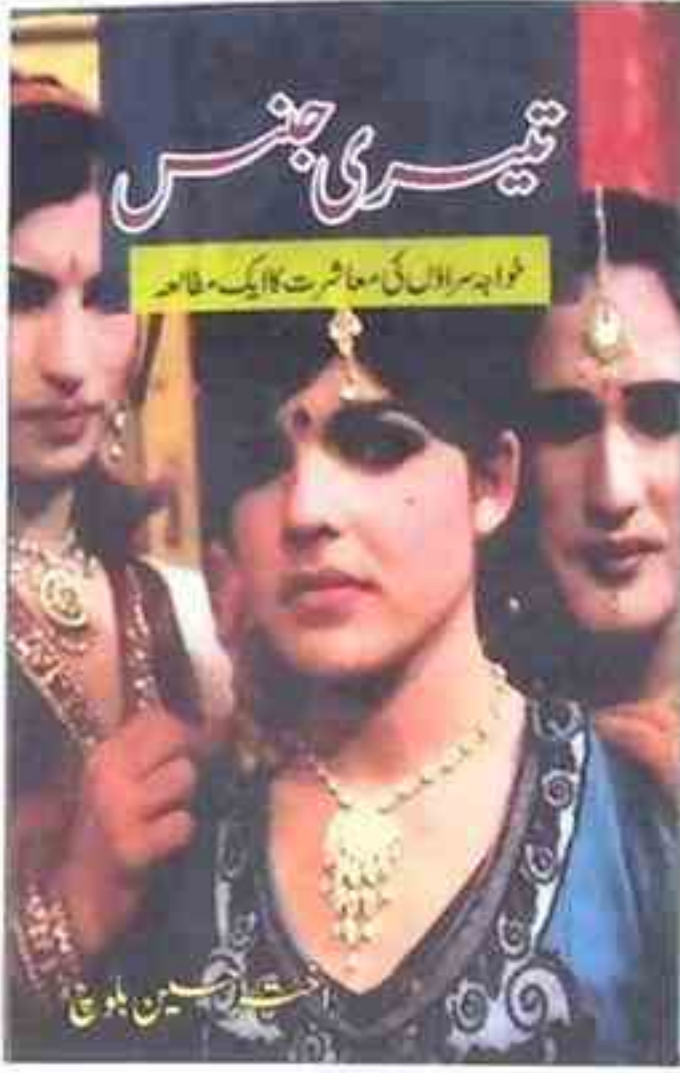
ISBN:978-969-781-914-0

Rs.300